

تَفْهِيمُ الْوَلَدَنَ

سُورَةُ الشُّعْرَاءَ

QuranUrdu.com

۲۶

سید ابوالاعلم مودودی

فہرست

4	نام:	رکو ۱۶
4	زمانہ نزول:	رکو ۲۶
4	موضوع اور مباحث:	رکو ۳۶
7		رکو ۴۶
14		رکو ۵۶
28		رکو ۶۶
38		رکو ۷۶
46		رکو ۸۶
63		رکو ۹۶

76	رکو۶
83	رکو۸
103	رکو۹
111	رکو۱۰
117	رکو۱۱

نام:

آیت 224 **وَالشُّرَّ آءِيَتْبِعُهُمُ الْغَاوَنَ** سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول:

مضمون و راندہ بیان سے محسوس ہوتا ہے اور روایات اس کی تائید کرتی ہیں کہ اس سورے کا زمانہ نزول مکہ کا دور متوسط ہے۔ ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ پہلے سورہ طٰنا نازل ہوئی پھر واقعہ اور اس کے بعد الشعرا (روح المعانی جلد 19 صفحہ 64)۔ اور سورہ طٰا کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ حضرت عمر کے قبول اسلام سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

موضوع اور مباحث:

تقریر کا پس منظر یہ ہے کہ کفار مکہ نبی ﷺ کی تبلیغ و تذکیر کا مقابلہ چیم جھود و انکار سے کر رہے تھے اور اس کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشے چلے جاتے تھے۔ کبھی کہتے کہ تم نے ہمیں کوئی نشانی تو دکھائی ہی نہیں، پھر ہمیں کیسے یقین آئے کہ تم نبی ہو۔ کبھی آپ ﷺ کو شاعر اور کاہن قرار دے کر آپ ﷺ کی تعلیم و تلقین کو باتوں میں اڑادینے کی کوشش کرتے۔ اور کبھی یہ کہہ کر آپ ﷺ کے مشن کا استخفاف کرتے کہ ان کے پیرو یا تو چند نادان نوجوان ہیں، یا پھر ہمارے معاشرے کے ادنی طبقات کے لوگ، حالانکہ اگر اس تعلیم میں کوئی جان ہوتی تو اشراف قوم اور شیوخ اس کو قبول کرتے۔ نبی ﷺ ان لوگوں کو معقول دلائل کے ساتھ ان کے عقائد کی غلطی اور توحید و معاد کی صداقت سمجھانے کی کوشش کرتے کرتے تھے جاتے تھے، مگر

وہ ہٹ دھرمی کی نت نئی صورتیں اختیار کرتے نہ تھکتے تھے۔ یہی چیز آنحضرت ﷺ کے لیے سوہان روح بنتی ہوئی تھی اور اس غم میں آپ کی جان گھلی جاتی تھی۔

ان حالات میں یہ سورت نازل ہوئی۔ کلام کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ تم ان کے پے چھ ہی جان کیوں گھلاتے ہو؟ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کوئی نشانی نہیں دیکھی ہے، بلکہ اس کی وجہ پر ہے کہ یہ ہٹ دھرم ہیں، سمجھانے سے نہیں ماننا چاہتے، کسی ایسی نشانی کے طالب میں جوز بردستی ان کی گرد نہیں جھکا دے، اور وہ نشانی اپنے وقت پر جب آجائے گی تو انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ جو بات انہیں سمجھائی جا رہی تھی وہ کیسی برحق تھی۔ اس تمہید کے بعد سویں رکوع تک جو مضمون مسلسل بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ طالب حق لوگوں کے لیے تو خدا کی زمین پر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ حقیقت کو پہچان سکتے ہیں۔ لیکن ہٹ دھرم لوگ کبھی کسی چیز و دلیل کر بھی ایمان نہیں لائے ہیں، نہ آفاق کی نشانیاں دیکھ کر اور نہ انبیاء کے معجزات دیکھ کر یہ وہ تو ہمیشہ اس وقت تک اپنی ضلالت پر جمے رہے ہیں جب تک خدا کے عذاب نے آکر ان کو گرفت میں نہیں لے لیا ہے۔ اسی مناسبت سے تاریخ کی سات قوموں کے حالات پیش کیے گئے ہیں جنہوں نے اسی ہٹ دھرم سے کام لیا تھا جس سے کفار مکہ کام لے رہے تھے۔ اور اس تاریخی بیان کے ضمن میں چند باتیں ذہن نشین کرائی گئی ہیں:-

اول یہ کہ نشانیاں دو طرح کی ہیں۔ ایک قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو خدا کی زمین پر ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جنہیں دیکھ کر ہر صاحب عقل آدمی تحقیق کر سکتا ہے کہ نبی جس چیز کی طرف بلارہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔ دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو فرعون اور اسکی قوم نے دیکھیں، قوم نوح نے دیکھیں، عاد اور ثمود نے دیکھیں، قوم لوط اور اصحاب الائکہ نے دیکھیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا خود کفار کا اپنا کام ہے کہ وہ کس قسم کی نشانی دیکھا چاہتے ہیں۔

دوم یہ کہ ہر زمانے میں کفار کی ذہنیت ایک سی رہی ہے۔ ان کی جھتنیں ایک ہی طرح کی تھیں۔ ان کے اعتراضات یکساں تھے۔ ایمان نہ لانے کے لیے ان کے حیلے اور بہانے یکساں تھے۔ اور آخر کار ان کا انجمام بھی یکساں ہی رہا۔ اس کے برعکس ہر زمانے میں انبیاء کی تعلیم ایک تھی۔ ان کی سیرت و اخلاق کارنگ ایک تھا۔ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں ان کی دلیل و جحت کا انداز ایک تھا۔ اور ان سب کے ساتھ اللہ کی رحمت کا معاملہ بھی ایک تھا۔ یہ دونوں نمونے تاریخ میں موجود ہیں۔ کفار خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان کی اپنی تصویر کس نمونے سے ملتی ہے اور محمد ﷺ کی ذات میں کس نمونے کی علامات پائی جاتی ہیں۔

تیسرا بات جو بار بار دہرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا بر دست، قادر و تو انابھی ہے اور رحیم بھی۔ تاریخ میں اس کے قہر کی مثالیں بھی موجود ہیں اور رحمت کی بھی۔ اب یہ بات لوگوں کو خود ہی طے کرنی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس کے رحم کا مستحق بناتے ہیں یا قہر کا۔

آخری رکوع میں اس بحث کو سمجھتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگ اگر نشانیاں ہی دیکھنا چاہتے ہو، تو آخر وہ خوفناک نشانیاں دیکھنے پر کیوں اصرار کرتے ہو جو تباہ شدہ قوموں نے دیکھی ہیں۔ اس قرآن کو دیکھو جو تمہاری اپنی زبان میں ہے۔ محمد ﷺ کو دیکھو۔ ان کے ساتھیوں کو دیکھو۔ کیا یہ کلام کسی شیطان یا جن کا کلام ہو سکتا ہے؟ کیا اس کلام کا پیش کرنے والا تمہیں کا ہن نظر آتا ہے؟ کیا محمد ﷺ اور ان کے اصحاب تمہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے شاعر اور ان کے ہم مشرب ہوا کرتے ہیں؟ ضد مضمود اکی بات دوسری ہے، مگر اپنے دلوں کو طیول کر دیکھو کہ وہ کیا شہادت دیتے ہیں۔ اگر دلوں میں تم خود جانتے ہو کہ کہانت اور شاعری سے اس کا کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے تو پھر یہ بھی جان لو کہ تم ظلم کر رہے ہو اور ظالموں کا سا انجمام دیکھ کر رہو گے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

رَكْوَاتُ

طَسَّمٌ ﴿١﴾ تِلْكَ أَيْتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ﴿٢﴾ لَعَلَّكَ بَاخِعًّا نَفْسَكَ إِلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٣﴾ إِنْ
نَّشَا نُنَزِّلُ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ أَيَّةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَضِيعِينَ ﴿٤﴾ وَمَا يَأْتِيَهُمْ مِنْ ذُكْرٍ
مِنَ الرَّحْمَنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ ﴿٥﴾ فَقَدْ كَذَّبُوا فَسِيَّاً تِيَّهُمْ أَنْبَوْا مَا كَانُوا بِهِ
يَسْتَهِزُّءُونَ ﴿٦﴾ أَوْ لَمْ يَرُوا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ ﴿٧﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ
لَا يَةً طَّ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٨﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٩﴾

دکوں ۱

اللہ کے نام سے جور حمان و رحیم ہے۔

ط۔ س۔ م۔ یہ کتابِ مبین کی آیات ہیں۔ ^۱

اے محمد، شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ^۲ ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گرد نہیں اس کے آگے جھٹک جائیں۔ ^۳ ان لوگوں کے پاس رحمٰن کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اب کہ یہ جھٹلاپکے ہیں، عنقریب ان کو اس چیز کی حقیقت ^۴ مختلف طریقوں سے ^۵ معلوم ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اُڑاتے رہے ہیں۔

اور کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں؟ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے ^۵ ، مگر ان میں سے اکثر مانند والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرارت زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ^۶ ^۷

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: ۱ ▲

یعنی یہ آیات جو اس سورے میں پیش کی جا رہی ہیں، اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا معا صاف کھول کر بیان کرتی ہے۔ جسے پڑھ کر یاسن کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہ کس چیز کی طرف بلاتی ہے، کس چیز سے روکتی ہے، کسے حق کہتی ہے اور کسے باطل قرار دیتی ہے۔ ماننا یانہ ماننا الگ بات ہے، مگر کوئی شخص یہ بہانہ کبھی نہیں بن سکتا کہ اس کتاب کی تعلیم اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ اس سے یہ معلوم ہی نہ کر سکا کہ وہ اس کو کیا چیز چھوڑنے اور کیا اختیار کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔

قرآن کو **الْكِتَابُ الْمُبِينُ** کہنے کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے، اور وہ یہ کہ اس کا کتاب الہی ہونا ظاہر و باہر ہے۔ اس کی زبان، اس کا بیان، اس کے مضامین، اس کے پیش کردہ حقائق، اور اس کے حالات نزول، سب کے سب صاف صاف دلالت کر رہے ہیں کہ یہ خداوند عالم ہی کی کتاب ہے۔ اس لحاظ سے ہر فقرہ جو اس کتاب میں آیا ہے ایک نشانی اور ایک مجزہ (آیت) ہے۔ کوئی شخص عقل و خرد سے کام لے تو اسے محمد ﷺ کی نبوت کا یقین کرنے کے لیے کسی اور نشانی کی حاجت نہیں، کتاب مبین کی یہی آیات (نشانیاں) اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہیں۔

یہ مختصر تمہیدی فقرہ اپنے دونوں معنوں کے لحاظ سے اس مضمون کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے جو آگے اس سورہ میں بیان ہوا ہے۔ کفار مکہ نبی ﷺ سے مجزہ مانگتے تھے تاکہ اس نشانی کو دیکھ کر انہیں اطمینان ہو کہ واقعی آپ ﷺ یہ پیغام خدا کی طرف سے لائے ہیں۔ فرمایا گیا کہ اگر حقیقت میں کسی کو ایمان لانے کے لیے نشانی کی طلب ہے تو کتاب مبین کی یہ آیات موجود ہیں۔ اسی طرح کفار نبی ﷺ پر الزام رکھتے تھے کہ آپ شاعر یا کاہن ہیں۔ فرمایا گیا کہ یہ کتاب کوئی چیستاں اور معما تو نہیں ہے۔ صاف صاف کھول کر اپنی تعلیم پیش کر رہی ہے۔ خود ہی دیکھ لو کہ یہ تعلیم کسی شاعر یا کاہن کی ہو سکتی ہے؟

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 2 ▲

نبی ﷺ کی اس حالت کا ذکر قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ کھف میں فرمایا **فَلَعَلَكَ**
بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَى أَثَارِهِمْ إِنَّ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثَ أَسْفًا ﴿٦﴾ شاید تم ان کے پچھے غم کے
 مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔ (آیت 6)۔ اور سورہ فاطر میں ارشاد ہوا
فَلَا تَذَاهَبْ نَفْسَكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَتِ ^۶ ان لوگوں کی حالت پر رنج و افسوس میں تمہاری جان نہ گھلنے " (آیت
 8)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اپنی قوم کی گمراہی و ضلالت، اس کی اخلاقی پسقی، اس کی ہٹ
 دھرمی، اور اصلاح کی ہر کوشش کے مقابلے میں اس کی مزاحمت کارنگ دیکھ دیکھ کر نبی ﷺ بر سوں اپنے
 شب و روز کس دل گدازو جاں گسل کیفیت میں گزارتے رہے ہیں۔ **بَخْم** کے اصل معنی پوری طرح ذبح کر
 ڈالنے کے ہیں۔ **بَاخِعٌ نَفْسَكَ** کے لغوی معنی یہ ہوئے کہ تم اپنے آپ کو قتل کیے دے رہے ہو۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 3 ▲

یعنی کوئی ایسی نشانی نازل کر دینا جو تمام کفار کو ایمان و طاعت کی روشن اختیار کرنے پر مجبور کر دے، اللہ تعالیٰ
 کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ کام اس کی قدرت سے
 باہر ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کا جری ایمان اس کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ عقل
 و خرد سے کام لے کر ان آیات کی مدد سے حق کو پہچانیں جو کتاب الہی میں پیش کی گئی ہیں، جو تمام آفاق میں ہر
 طرف پھیلی ہوئی ہیں، جو خود ان کی اپنی ہستی میں پائی جاتی ہیں۔ پھر جب ان کا دل گواہی دے کہ واقعی حق وہی
 ہے جسے انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے، اور اس کے خلاف جو عقیدے اور طریقے رانج ہیں وہ باطل ہیں، تو
 جان بوجھ کر باطل کو چھوڑیں اور حق کو اختیار کریں۔ یہی اختیاری ایمان اور ترک باطل اور اتباع حق وہ چیز ہے

جو اللہ تعالیٰ انسان سے چاہتا ہے۔ اسیے اس نے انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی دی ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسان کو یہ قدرت عطا کی ہے کہ صحیح اور غلط، جس راہ پر بھی وہ جانا چاہے جاسکے۔ اسی وجہ سے اس نے انسان کے اندر خیر اور شر کے دونوں رجحانات رکھ دیے ہیں، فجور اور تقویٰ کی دونوں را ہیں اس کے آگے کھول دی ہیں، شیطان کو بہر کانے کی آزادی عطا کی ہے، نبوت اور وحی اور دعوت خیر کا سلسلہ راہ راست دکھانے کے لیے قائم کیا ہے، اور انسان کو انتخاب راہ کے لیے ساری مناسب حال صلاحیتیں دے کر اس امتحان کے مقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ وہ کفر و فسق کا راستہ اختیار کرتا ہے یا ایمان و طاعت کا۔ اس امتحان کا سارا مقصد ہی فوت ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کوئی ایسی تدبیر اختیار فرمائے جو انسان کو ایمان اور اطاعت پر مجبور کر دینے والی ہو۔ جبکہ ایمان ہی مطلوب ہوتا تو نشانیاں نازل کر کے مجبور کرنے کی کیا حاجت تھی، اللہ تعالیٰ انسان کو اسی فطرت اور ساخت پر پیدا فرما سکتا تھا جس میں کفر، نافرمانی اور بدی کا کوئی امکان نہ ہوتا، بلکہ فرشتوں کی طرح انسان بھی پیدائشی فرما بردار ہوتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف متعدد مواقع پر قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً

فَرِمَا يَوْمَ شَاءَ رَبُّكَ لَامَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۖ أَفَأَنَّتَ تُكَرِّهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا

مُؤْمِنِينَ ۹۹ اگر تمہارا رب چاہتا تو زمین کے رہنے والے سب کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ اب کیا تم

لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرو گے؟"؟ (یونس، آیت 99)۔ اور

وَاحِدَةٌ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ۝ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذِلِكَ خَلَقَهُمْ ۝

اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی امت بناسکتا تھا۔ وہ تو مختلف را ہوں پر ہی چلتے رہیں گے (اور بے راہ رو یوں سے) صرف وہی بچپیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی لیے تو اس نے ان کو پیدا کیا تھا۔ (ہود۔ آیت 119)۔ مزید

ترسخ کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم (یونس، حواشی 101-102۔ ہود، حاشیہ 116)۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 4 ▲

یعنی جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ معقولیت کے ساتھ ان کو سمجھانے اور راہ راست دکھانے کی جو کوشش بھی کی جائے اس کا مقابلہ بے رخی و بے التفاتی سے کریں، ان کا علاج یہ نہیں ہے کہ ان کے دل میں زبردستی ایمان اتارنے کے لیے آسمان سے نشانیاں نازل کی جائیں، بلکہ ایسے لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ جب ایک طرف انہیں سمجھانے کا حق پورا پورا ادا کر دیا جائے اور دوسری طرف وہ بے رخی سے گزر کر قطعی اور کھلی تکنذیب پر، اس سے بھی آگے بڑھ کر حقیقت کا مذاق اڑانے پر اتر آئیں، تو ان کا انجام بد انہیں دکھادیا جائے۔ یہ انجام بد اس شکل میں بھی انہیں دکھایا جا سکتا ہے کہ دنیا میں وہ حق ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی ساری مزاجتوں کے باوجود غالب آجائے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ اس کی شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان پر ایک عذاب الیم نازل ہو جائے اور وہ تباہ و بر باد کر کے رکھ دیے جائیں۔ اور وہ اس شکل میں بھی ان کے سامنے آسکتا ہے کہ چند سال اپنی غلط فہمیوں میں مبتلا رہ کر وہ موت کی ناگزیر منزل سے گزریں اور آخر کار ان پر ثابت ہو جائے کہ سراسر باطل تھا جس کی راہ میں انہوں نے اپنی تمام سرمایہ زندگانی کھپا دیا اور حق وہی تھا جسے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے تھے اور جسے یہ عمر بھر ٹھٹھوں میں اڑاتے رہے۔ اس انجام بد کے سامنے آنے کی چونکہ بہت سی شکلیں ہیں اور مختلف لوگوں کے سامنے وہ مختلف صورتوں سے آسکتا ہے اور آخر کار بہت سی مخالف کے بجائے **انباء** بصیغہ جمع فرمایا گیا، یعنی جس چیز کا یہ مذاق اڑا رہے ہیں اس کی حقیقت آخر کار بہت سی مختلف شکلوں میں انہیں معلوم ہو گی۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 5 ▲

یعنی جستجوئے حق کے لیے کسی کو نشانی کی ضرورت ہو تو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، آنکھیں کھول کر ذرا اس زمین ہی کی روئیدگی کو دیکھ لے، اسے معلوم ہو جائے گا کہ نظام کائنات کی جو حقیقت (توحید اللہ) انبیاء علیہم السلام

پیش کرتے ہیں وہ صحیح ہے، یادوں نظریات صحیح ہیں جو مشرکین یا منکرین خدا بیان کرتے ہیں۔ زمین سے اگنے والی بے شمار انواع و اقسام کی چیزیں جس کثرت سے اگ رہی ہیں، جن مادوں اور قوتوں کی بدولت اگ رہی ہیں، جن قوانین کے تحت اگ رہی ہیں، پھر ان کی خواص اور صفات میں اور بے شمار مخلوقات کی ان گنت ضرورتوں میں جو صریح مناسبت پائی جاتی ہے، ان ساری چیزوں کو دیکھ کر صرف ایک احمق ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کی حکمت، کسی علیم کے علم، کسی قادر و توانا کی قدرت اور کسی خالق کے منصوبہ تخلیق کے بغیر بس یونہی آپ سے آپ ہو رہا ہے۔ یا اس سارے منصوبے کو بنانے اور چلانے والا کوئی ایک خدا نہیں ہے بلکہ بہت سے خداوں کی تدبیر نے زمین اور آفتاب و ماہتاب اور ہوا اور پانی کے درمیان یہ ہم آہنگی، اور ان وسائل سے پیدا ہونے والی نباتات اور بے حد و حساب مختلف النوع جانداروں کی حاجات کے درمیان یہ مناسبت پیدا کر رکھی ہے۔ ایک ذی عقل انسان ہو، اگر وہ کسی ہٹ دھرمی اور پیشگی تعصب میں مبتلا نہیں ہے، اس منظر کو دیکھ کر بے اختیار پکارا ٹھے گا کہ یقیناً یہ خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کھلی کھلی علامات ہیں۔ ان نشانیوں کے ہوتے اور کس معجزے کی ضرورت ہے جسے دیکھے بغیر آدمی کو توحید کی صداقت کا یقین نہ آسکتا ہو؟

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 6 ▲

یعنی اس کی قدرت تو ایسی زبردست ہے کہ کسی کو سزادینا چاہے تو پل بھر میں مٹا کر رکھ دے۔ مگر اس کے باوجود یہ سراسر اس کا رحم ہے کہ سزادینے میں جلدی نہیں کرتا۔ برسوں اور صدیوں ڈھیل دیتا ہے، سوچنے اور سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت دیے جاتا ہے، اور عمر بھر کی نافرمانیوں کو ایک توبہ پر معاف کر دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔

وَإِذْ نَادَى رَبُّكَ مُوسَى أَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّلِيمِينَ ٢١ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ٢٢ أَلَا يَتَّقُونَ ٢٣ قَالَ رَبِّي إِنِّي
 أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ٢٤ وَيَضِيقُ صَدْرِيٌّ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيٌ فَأَرْسِلْ إِلَيْهِمْ ٢٥ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَبْحٌ
 فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ٢٦ قَالَ كَلَّا ٢٧ فَأَذْهَبَا بِأَيْتِنَا إِنَّا مَعْكُمْ مُّسْتَعِنُونَ ٢٨ فَأَتَيَا فِرْعَوْنَ
 فَقُولَا إِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعَلَمِينَ ٢٩ أَنْ أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ٣٠ قَالَ أَلَمْ نُرِّبْكَ فِينَا وَلِيَدًا
 وَلَيُشْتَرِطَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ ٣١ وَفَعَلْتَ فَعَلْتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكُفَّارِينَ ٣٢ قَالَ
 فَعَلْتُهَا إِذَا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ ٣٣ فَفَرَّتْ مِنْكُمْ لِمَا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَجَعَلَنِي
 مِنَ الْمُرْسَلِينَ ٣٤ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَعْنِهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَدْتَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ٣٥ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ
 الْعَلَمِينَ ٣٦ قَالَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْقِنِينَ ٣٧ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ
 أَلَا تَسْتَعِنُونَ ٣٨ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ أَبَاءِكُمُ الْأَوَّلِينَ ٣٩ قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ
 إِلَيْكُمْ لَمْ جُنُونٌ ٤٠ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ٤١ قَالَ لِئِنْ
 اتَّخَذْتَ إِلَهًا غَيْرِي لَا جَعَلْنَاكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ ٤٢ قَالَ أَوْلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِينٍ ٤٣ قَالَ
 فَأُتِ بِهِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ٤٤ فَأَلْقَى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعبَانٌ مُّبِينٌ ٤٥ وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ

رکو ۶

انہیں اُس وقت کا قصہ سناؤ جب کہ تمہارے رب نے موسیٰ کو پکارا **7** ”ظالم قوم کے پاس جا۔۔۔ فرعون کی قوم کے پاس **8**۔۔۔ کیا وہ نہیں ڈرتے؟ **9** ”اُس نے عرض کیا ”اے میرے رب، مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ کو جھٹکا دیں گے۔ میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔ آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں۔ **10** اور مجھ پر ان کے ہاں ایک جرم کا الزام بھی ہے، اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ **11** ”فرمایا ”ہر گز نہیں، تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر **12**، ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے۔ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو، ہم کو رب العالمین نے اس لیے بھیجا ہے کہ تو بني اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔“

13

فرعون نے کہا ”کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچھ سا نہیں پالا تھا؟ **14** تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے، اور اس کے بعد کر گیا جو کچھ کہ کر گیا **15**، تو بڑا احسان فراموش آدمی ہے۔“

موسیٰ نے جواب دیا ”اُس وقت وہ کام میں نے نادانستگی میں کر دیا تھا۔ **16** پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا۔ اس کے بعد میرے رب نے مجھ کو حکم عطا کیا **17** اور مجھے رسولوں میں شامل فرمالیا۔ رہا تیرا احسان جو تو نے مجھ پر جتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا تھا۔ **18**“

فرعون نے کہا ”**19** اور یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟ **20**“

موسیٰ نے جواب دیا ”آسمانوں اور زمین کا رب، اور اُن سب چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، اگر تم یقین لانے والے ہو۔ **21**“

فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا ”سُنْتَ هُو؟“

موسیٰ نے کہا ”تمہارا رب بھی اور تمہارے اُن آباء اجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں۔“ **22**

فرعون نے ﴿حاضرین سے﴾ کہا ”تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔“

موسیٰ نے کہا ”مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے سب کا رب، اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں۔“ **23**

فرعون نے کہا ”اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود دمانا تو تجھے بھی اُن لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔“ **24**

موسیٰ نے کہا ”اگرچہ میں لے آؤں تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی؟“ **25**

فرعون نے کہا ”اچھا تو لے آاگر تو سچا ہے۔“ **26**

﴿اس کی زبان سے یہ بات نکلتے ہی﴾ موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یک ایک وہ ایک صریح اذدھا تھا۔ **27** پھر اس نے اپنا ہاتھ ﴿بغل سے﴾ کھینچا اور وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ **28**

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 7 ▲

اوپر کی مختصر تمہیدی تقریر کے بعد اب تاریخی بیان کا آغاز ہو رہا ہے جس کی ابتداء حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے قصے سے کی گئی ہے۔ اس سے خاص طور پر جو سبق دینا مقصود ہے وہ یہ کہ:

اولاً، حضرت موسیٰؑ کو جن حالات سے سابقہ پیش آیا تھا وہ ان حالات کی بہ نسبت بدر جہاز یادہ سخت تھے جن سے نبی ﷺ کو سابقہ در پیش تھا۔ حضرت موسیٰؑ ایک غلام قوم کے فرد تھے جو فرعون اور اس کی قوم سے بری طرح دبی ہوئی تھی، بخلاف اس کے نبی ﷺ قریش کے ایک فرد تھے اور آپ ﷺ کا خاندان قریش کے دوسرے خاندانوں کے ساتھ بالکل برابر کی پوزیشن رکھتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے خود اس فرعون کے گھر میں پروردش پائی تھی اور ایک قتل کے الزام میں دس برس روپوش رہنے کے بعد انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اسی بادشاہ کے دربار میں جا کھڑے ہو جس کے ہاں سے وہ جان بچا کر فرار ہوئے تھے نبی ﷺ کو ایسی کسی نازک صورت حال سے سابقہ نہ تھا۔ پھر فرعون کی سلطنت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقتور سلطنت تھی۔ قریش کی طاقت کو اس کی طاقت سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اس کے باوجود فرعون حضرت موسیٰؑ کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور آخر کار ان سے ٹکر اکر تباہ ہو گیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کفار قریش کو یہ سبق دینا چاہتا ہے کہ جس کی پشت پر اللہ کا ہاتھ ہو اس کا مقابلہ کر کے کوئی جیت نہیں سکتا۔ جب فرعون کی موسیٰؑ علیہ السلام کے سامنے کچھ پیش نہ گئی تو تم بیچارے کیا ہستی ہو کہ محمد ﷺ کے مقابلہ میں بازی جیت لے جاؤ گے۔

ثانیاً جو نشانیاں حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے فرعون کو دکھائی گئیں اس سے زیادہ کھلی نشانیاں اور کیا ہو سکتی ہیں۔ پھر ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں فرعون ہی کے چینچ پر علی الاعلان جادو گروں سے مقابلہ کرائے گئے تھے۔ اس کے یہ ثابت بھی کر دیا گیا کہ جو کچھ حضرت موسیٰؑ دکھار ہے ہیں وہ جادو نہیں ہے۔ فن سحر کے جو ماہرین فرعون کی اپنی قوم سے تعلق رکھتے تھے اور اس کے اپنے بلائے ہوئے تھے۔ انہوں نے خود یہ تصدیق کر دی کہ حضرت موسیٰؑ کی

لاٹھی کا اژدھا بن جانا ایک حقیقی تغیر ہے اور یہ صرف خدائی مجزے سے ہو سکتا ہے، جادوگری کے ذریعہ سے ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ ساحروں نے ایمان لا کر اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس امر میں کسی شک کی گنجائش بھی باقی نہ چھوڑی کہ حضرت موسیٰؑ کی پیش کردہ نشانی واقعی مجزہ ہے، جادوگری نہیں ہے۔ لیکن اس پر بھی جو لوگ ہٹ دھرمی میں مبتلا تھے انہوں نے نبی کی صداقت تسلیم کر کے نہ دی۔ اب تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہارا ایمان لانا درحقیقت کوئی حسی مجزہ اور مادی نشان دیکھنے پر موقوف ہے۔ تعصُّب، حمیت جاہلیہ، اور مفاد پرستی سے آدمی پاک ہو اور کھلے دل سے حق اور باطل کا فرق سمجھ کر غلط بات کو چھوڑنے اور صحیح بات قبول کرنے کے لیے کوئی شخص تیار ہو تو اس کے لیے وہی نشانیاں کافی ہیں جو اس کتاب میں اور اس کے لانے والے کی زندگی میں اور خدا کی وسیع کائنات میں ہر آنکھوں والا ہر وقت دیکھ سکتا ہے۔ ورنہ ایک ہٹ دھرم آدمی جسے حق کی جستجو ہی نہ ہو اور اغراض نفسانی کی بندگی میں مبتلا ہو کر جس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ کسی ایسی صداقت کو قبول نہ کرے گا جس سے اس کی اغراض پر ضرب لگتی ہو، وہ کوئی نشانی دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے گا خواہ زمین اور آسمان ہی اس کے سامنے کیوں نہ الٹ دیے جائیں۔

ثالثاً، اس ہٹ دھرم کا جو انجام فرعون نے دیکھا وہ کوئی ایسا انجام تو نہیں ہے جسے دیکھنے کے لیے دوسرے لوگ بے تاب ہوں۔ اپنی آنکھوں سے خدائی طاقت کے نشانات دیکھ لینے کے بعد جو نہیں مانتے وہ پھر ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ اب کیا تم لوگ اس سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے اس کا مرا چکھنا ہی پسند کرتے ہو؟

تقابل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، الاعراف، آیات 103 تا 137۔ یونس، 75 تا 92۔ بنی اسرائیل، 101 تا 104۔ جلد سوم لٹا، 9 تا 79۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 8 ▲

یہ انداز بیان قوم فرعون کے انتہائی ظلم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا تعارف ہی "ظالم قوم" کے لقب سے کرایا گیا ہے۔ گویا اس کا اصل نام ظالم قوم ہے اور قوم فرعون اس کا ترجمہ و تفسیر۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 9 ▲

یعنی اے موسیٰ، دیکھو کیسی عجیب بات ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مختار مطلق سمجھتے ہوئے دنیا میں ظلم و ستم ڈھائے جا رہے ہیں اور اس بات سے بے خوف ہیں کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو ان سے باز پرس کرنے والا ہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 10 ▲

سورہ طار کو ۴، اور سورہ فقصص رکو ۴ میں اس کی جو تفصیل آئی ہے اسے ان آیات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اول تو اتنے بڑے مشن پر تھا جاتے ہوئے گھبرا تے تھے (میرا سینہ گھٹتا ہے کے الفاظ اسی کی نشان دہی کرتے ہیں)، دوسرے ان کو یہ بھی احساس تھا کہ وہ روانی کے ساتھ تقریر نہیں کر سکتے۔ اس لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ حضرت ہارونؑ کو ان کے ساتھ مددگار کی حیثیت سے نبی بنائے جائے کیونکہ وہ زیادہ زبان آور ہیں، جب ضرورت پیش آئے گی تو وہ ان کی تائید و تصدیق کر کے ان کی پشت مضبوط کریں گے۔ ممکن ہے کہ ابتداءً حضرت موسیٰؑ کی درخواست یہ رہی ہو کہ آپ کے بجائے حضرت ہارونؑ کو اس منصب پر مأمور کیا جائے، اور بعد میں جب آپ نے محسوس کیا ہو کہ مرضی الہی آپ ہی کو مأمور کرنے کی ہے تو پھر یہ درخواست کی ہو کہ انہیں آپ کا وزیر اور مددگار بنایا جائے۔ یہ شبہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہاں حضرت موسیٰؑ ان کا وزیر بنانے کی درخواست نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ عرض کر رہے ہیں یہ فَأَرْسِلْ إِلَى هَرُونَ آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں"۔ اور سورہ طا میں وہ یہ گزارش کرتے ہیں کہ وَجَعَلْ لِّي وَزِيرًا مِنْ أَهْلِي هَارُونَ أَخْرَی میرے لیے خاندان میں سے ایک

وزیر مقرر فرمادیجیے، میرے بھائی ہارون کو"۔ نیز سورہ قصص میں وہ یہ عرض کرتے ہیں کہ **وَأَنْجِيْ هُرُونَ هُوَ أَفْصُحُ مِنِّيْ لِسَانًاً فَارْسِلْهُ مَعِيْ رِدَاءً يُصَدِّقِنِيْ** میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہیں لہذا انہیں مددگار کے طور پر میرے ساتھ بھیجیے تاکہ وہ میری تصدیق کریں"۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً یہ مؤخر الذکر دونوں درخواستیں بعد کی تھیں، اور پہلی بات وہی تھی جو حضرت موسیٰ سے اس سورے میں نقل ہوئی ہے۔

بائیبل کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ کہتی ہے کہ حضرت موسیٰ نے قوم فرعون کی تکذیب کا خوف اور اپنی زبان کے کند ہونے کا اذر پیش کر کے یہ منصب قبول کرنے سے بالکل ہی انکار کر دیا تھا: "اے خداوند میں تیری منت کرتا ہوں۔ کسی اور کے ہاتھ سے جسے تو چاہے یہ پیغام بھیج"۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بطور خود حضرت ہارونؑ کو ان کے لیے مددگار مقرر فرمایا کہ انہیں اس بات پر راضی کیا کہ دونوں بھائی مل کر فرعون کے پاس جائیں (خروج باب 4۔ آیات اتا 71) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، طا، حاشیہ 19۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 11 ▲

یہ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جو سورہ قصص روایت 2 میں بیان ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ نے قوم فرعون کے ایک شخص کو ایک اسرائیل سے لڑتے دیکھ کر ایک گھونسamar دیا تھا جس سے وہ مر گیا۔ پھر جب حضرت موسیٰ کو معلوم ہوا کہ اس واقعہ کی اطلاع قوم فرعون کے لوگوں کو ہو گئی ہے اور وہ بدله لینے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ملک چھوڑ کر مذین کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ اب جو آٹھ دس سال کی روپوشنی کے بعد یک ایک انہیں یہ حکم دیا گیا کہ تم پیغام رسالت لے کر اسی فرعون کے دربار میں جا کھڑے ہو جس کے ہاں تمہارے خلاف قتل کا مقدمہ پہلے سے موجود ہے تو حضرت موسیٰ کو بجا طور پر یہ خطرہ ہوا کہ پیغام سنانے کی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ تو مجھے اس قتل کے الزام میں پھانس لے گا۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 12 ▲

شانیوں سے مراد عصا اور یہ بیضاء کے مجھزے ہیں جن کے عطا کیے جانے کی تفصیل سورہ الاعراف رکوع 13۔ 14، طار کوع 1، سورہ نمل رکوع 1، اور سورہ فقصص رکوع 4 میں بیان ہوئی ہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 13 ▲

حضرت موسیٰ وہارون کی دعوت کے دو جز تھے: ایک، فرعون کو اللہ کی بندگی کی طرف بلانا، جو تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا اصل مقصود رہا ہے۔ دوسرے، بنی اسرائیل کو فرعون کے بند غلامی سے نکالنا، جو مخصوص طور پر انہیں دونوں حضرات کا مشن تھا۔ قرآن مجید میں کسی جگہ صرف پہلے جزء کا ذکر کیا گیا ہے۔ (مثلاً سورہ نازعات میں) اور کسی جگہ صرف دوسرے جز کا۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 14 ▲

اس سے ایک اشارہ اس خیال کی تائید میں نکلتا ہے کہ یہ فرعون وہ فرعون نہ تھا جس کے گھر میں حضرت موسیٰ نے پروش پائی تھی، بلکہ یہ اس کا بیٹا تھا۔ اگر یہ وہی فرعون ہوتا تو کہتا کہ میں نے تجھے پالا تھا۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ ہمارے ہاں تور ہا ہے اور ہم نے تیری پروش کی ہے۔ (اس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم الاعراف، حواشی 85-93)۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 15 ▲

اشارة ہے اسی واقعہ قتل کی طرف جو حضرت موسیٰ سے سرزد ہو گیا تھا۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 16 ▲

اصل الفاظ ہیں **وَأَنَا مِنَ الظَّالِمِينَ** ”میں اس وقت ضلالت میں تھا“۔ یا ”میں نے اس وقت یہ کام ضلالت کی حالت میں کیا تھا“۔ یہ لفظ ضلالت لازماً ”گراہی“ کا ہم معنی نہیں ہے۔ بلکہ عربی زبان میں اسے ناواقفیت، نادانی، خطاء، نسیان، نادانستگی وغیرہ معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ سورہ فقصص میں بیان ہوا ہے

اس پر غور کرنے سے یہاں ضلالت بمعنی خطایانا دا نستگی ہی لینا زیادہ صحیح ہے۔ حضرت موسیٰ نے اس قبطی کو ایک اسرائیلی پر ظلم کرتے دیکھ کر صرف ایک گھونسما را تھا۔ ظاہر ہے کہ گھونسے سے بالعموم آدمی مرتا نہیں ہے، نہ قتل کی نیت سے گھونسما را جاتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس سے وہ شخص مر گیا۔ اس لیے صحیح صورت واقعہ یہی ہے کہ یہ قتل عدم نہیں بلکہ قتل خطایا تھا۔ قتل ہوا ضرور، مگر بالارادہ قتل کی نیت سے نہیں ہوا، نہ کوئی ایسا آلہ یا ذریعہ استعمال کیا گیا جو قتل کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے یا جس سے قتل واقع ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 17 ▲

یعنی علم و دانش اور پروانہ نبوت۔ حکم کے معنی حکمت و دانش کے بھی ہیں، اور اس سند اقتدار (Authority) کے بھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کو عطا کی جاتی ہے، جس کی بنیاب پر وہ اختیار کے ساتھ بولتا ہے

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 18 ▲

یعنی تیرے گھر میں پرورش پانے کے لیے میں کیوں آتا اگر تو نے بنی اسرائیل پر ظلم نہ ڈھایا ہوتا۔ تیرے ہی ظلم کی وجہ سے تو میری ماں نے مجھے ٹوکری میں ڈال کر دریا میں بھایا تھا۔ ورنہ کیا میری پرورش کے لیے میرا اپنا گھر موجود نہ تھا؟ اس لیے اس پرورش کا احسان جتنا تجھے زیب نہیں دیتا۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 19 ▲

پچ میں یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنے آپ کو رب العالمین کے رسول کی حیثیت سے پیش کر کے فرعون کو وہ پیغام پہنچایا جس کے لیے وہ بھیجے گئے تھے۔ یہ بات آپ سے آپ ظاہر ہے کہ نبی نے ضرور وہ پیغام پہنچا دیا ہو گا جس پر وہ مامور کیے گئے تھے، اس لیے اس کا ذکر کرنے کی حاجت نہ تھی۔ اسے چھوڑ کر اب وہ گفتگو نقل کی جاتی ہے جو اس پیغام کی تبلیغ کے بعد فرعون اور موسیٰ کے درمیان ہوئی۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 20 ▲

یہ اس کا سوال حضرت موسیٰ کے اس قول پر تھا کہ میں رب العالمین (تمام جہان والوں کے مالک و آقا اور فرمائروں) کی طرف سے بھیجا گیا ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔ اس پیغام کی نوعیت صریح طور پر سیاسی تھی۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ حضرت موسیٰ جس کی نمائندگی کے مدعی ہیں وہ سارے جہاں والوں پر حاکمیت و اقتدار اعلیٰ رکھتا ہے اور فرعون کو اپنا تابع قرار دے کر اس کے دائرہ حکومت و اقتدار میں ایک بالآخر فرمائز و اکی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ مداخلت کر رہا ہے بلکہ اس کے نام یہ فرمان بھیج رہا ہے کہ تو اپنی رعایا کے ایک حصے کو میرے نامزد کردہ نمائندے کے حوالے کر دے تاکہ وہ اسے تیری سلطنت سے نکال کر لے جائے۔ اس پر فرعون پوچھتا ہے کہ یہ سارے جہاں والوں کا مالک و فرمائز و اہے کون جو مصر کے بادشاہ کو اس کی رعایا کے ایک ادنیٰ فرد کے ہاتھوں یہ حکم بھیج رہا ہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 21 ▲

یعنی میں زمین پر بسنے والے کسی مخلوق اور فانی مدعیٰ ملوکیت کی طرف سے نہیں آیا ہوں، بلکہ اس کی طرف سے آیا ہوں جو آسمان و زمین کا مالک ہے۔ اگر تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ اس کائنات کا کوئی خالق اور مالک و فرمائز و اہے تو تمہیں یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی چاہیے کہ سارے جہاں والوں کا رب کون ہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 22 ▲

حضرت موسیٰ کا یہ خطاب فرعون کے درباریوں سے تھا۔ جن سے فرعون نے کہا تھا کہ "سنتے ہو"۔ حضرت موسیٰ نے ان سے فرمایا کہ میں ان جھوٹے ارباب کا قائل نہیں ہوں جو آج ہیں اور کل نہ تھے، اور کل تھے مگر آج نہیں ہیں۔ تمہارا یہ فرعون جو آج تمہارا رب بنائیا ہے کل نہ تھا اور کل تمہارے باپ دادا جن فرعونوں کو رب بنائے بیٹھے تھے وہ آج نہیں ہیں۔ میں صرف اس رب کی حاکمیت و فرمائی مانتا ہوں جو آج بھی تمہارا

اور اس فرعون کارب ہے، اور اس سے پہلے جو تمہارے اور اس کے باپ دادا گزر چکے ہیں ان سب کارب بھی تھا۔

▲ سورۃ الشعراء حاشیہ نمبر: 23

یعنی مجھے تو پاگل قرار دیا جا رہا ہے، لیکن آپ لوگ اگر عاقل ہیں تو خود سوچیے کہ حقیقت میں رب یہ بیچارا فرعون ہے جو زمین کے ایک ذرا سے رقبے پر بادشاہ بنایا بیٹھا ہے، یا وہ جو مشرق و مغرب کا مالک اور مصر سمیت ہر اس چیز کا مالک ہے جو مشرق و مغرب سے گھری ہوئی ہے۔ میں تو فرمائیں اسی کی مانتا ہوں اور اسی کی طرف سے یہ حکم اس کے ایک بندے کو پہنچا رہا ہوں۔

▲ سورۃ الشعراء حاشیہ نمبر: 24

اس گفتگو کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ آج کی طرح قدیم زمانے میں بھی "معبد" کا تصور صرف مذہبی معنوں تک محدود تھا۔ یعنی یہ کہ اسے بس پوجا پاٹ اور نذر و نیاز کا استحقاق پہنچتا ہے، اور اپنے فوق الفطری غلبہ و اقتدار کی وجہ سے اس کا یہ منصب بھی ہے کہ انسان اپنے معاملات میں اس سے استمداد و استعانت کے لیے دعا مانگیں۔ لیکن کسی معبد کی یہ حیثیت کہ وہ قانونی اور سیاسی معنوں میں بھی بالادست ہے، اور اسے یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ معاملات دنیا میں وہ جو حکم چاہے دے، اور انسانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کے امر و نہی کو قانون برتر مان کر اس کے آگے جھک جائیں، یہ چیز زمین کے مجازی فرمانرواؤں نے نہ پہلے کبھی مان کر دی تھی، نہ آج وہ اسے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ہمیشہ سے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں ہم مختار مطلق ہیں، کسی معبد کو ہماری سیاست اور ہمارے قانون میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ دنیوی حکومتوں اور بادشاہوں سے انبیاء علیہم السلام اور ان کی پیروی کرنے والے مصلحین کے تصادم کی اصل وجہ یہی رہی ہے۔ انہوں نے ان سے خداوند عالم کی حاکمیت و بالادستی تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے، اور یہ اس کے جواب میں نہ صرف یہ کہ اپنی حاکمیت مطلقہ کا دعوی پیش کرتی رہی ہیں بلکہ انہوں نے ہر اس شخص کو مجرم

اور باغی ٹھہرایا ہے جو ان کے سوا کسی اور کو قانون و سیاست کے میدان میں معبدومانے۔ اس تشریح سے فرعون کی اس گفتگو کا صحیح مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگر معاملہ پوجاپاٹ اور نذر و نیاز کا ہوتا تو اس کو اس سے کوئی بحث نہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ دوسرے دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ رب العالمین کو اس کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اگر صرف اسی معنی میں توحید فی العبادت کی دعوت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو دی ہوتی تو اسے غضب ناک ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ اگر وہ کچھ کرتا تو بس یہ کہ اپنا دین آبائی چھوڑنے سے انکار کر دیتا، یا حضرت موسیٰؑ سے کہتا کہ میرے مذہب کے پندتوں سے مناظرہ کرلو۔ لیکن جس چیز نے اسے غضبناک کر دیا وہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کر کے اسے اس طرح ایک سیاسی حکم پہنچایا کہ گویا وہ ایک ماتحت حاکم ہے اور ایک حاکم برتر کا پیغامبر آ کر اس سے اطاعت امر کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اس معنی میں وہ اپنے اوپر کسی کی سیاسی و قانونی برتری ماننے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ وہ یہ بھی گوارانہ کر سکتا تھا کہ اس کی رعایا میں سے کوئی فرد اس کے بجائے کسی اور کو حاکم برتر مانے۔ اسی لیے اس نے پہلے "رب العالمین" کی اصطلاح کو چیلنج کیا، کیونکہ اس کی طرف سے لائے ہوئے پیغام میں محض مذہبی معبدیت کا نہیں بلکہ کھلا کھلا سیاسی اقتدار اعلیٰ کا رنگ نظر آتا تھا۔ پھر جب حضرت موسیٰؑ نے بار بار تشریح کر کے بتایا کہ جس رب العالمین کا پیغام وہ لائے ہیں وہ کون ہے، تو اس نے صاف صاف دھمکی دی کہ ملک مصر میں تم نے میرے اقتدار اعلیٰ کے سوا کسی اور کے اقتدار کا نام بھی لیا تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 25 ▲

یعنی کیا تو اس صورت میں بھی میری بات ماننے سے انکار کرے گا اور مجھے جیل بھیجے گا جبکہ میں اس امر کی ایک صریح علامت پیش کر دوں کہ میں واقعی اس خدا کا فرستادہ ہوں جو رب العالمین، رب السموات والارض اور رب المشرق والمغرب ہے؟

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 26 ▲

حضرت موسیٰؑ کے سوال پر فرعون کا یہ جواب خود ظاہر کرتا ہے کہ اس کا حال قدیم و جدید زمانے کے عام مشرکین سے مختلف نہ تھا۔ وہ دوسرے تمام مشرکین کی طرح فوق الفطری معنوں میں اللہ کے **الله الاله** ہونے کو مانتا تھا اور ان ہی کی طرح یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ کائنات میں اس کی قدرت سب دیوتاؤں سے برتر ہے۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ اگر تجھے میرے مامور من اللہ ہونے کا یقین نہیں ہے تو میں ایسی صریح نشانیاں پیش کروں جن سے ثابت ہو جائے کہ میں اسی کا بھیجا ہوا ہوں۔ اور اسی وجہ سے اس نے بھی جواب دیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچ ہو تو لا و کوئی نشانی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی یا اس کے مالک کائنات ہونے ہی میں اسے کلام ہوتا تو نشانی کا سوال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا۔ نشانی کی بات تو اسی صورت میں درمیان آسکتی تھی جبکہ اللہ تعالیٰ کا وجود اور اس کا قادر مطلق ہونا تو مسلم ہو، اور بحث اس امر میں ہو کہ حضرت موسیٰؑ اس کے بھیجے ہوئے ہیں یا نہیں۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 27 ▲

قرآن مجید میں کسی جگہ اس کے لیے **حَيَّةٌ** (سانپ) اور کسی جگہ **جَانٌ** (جو بالعموم چھوٹے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور یہاں اسے **ثُعْبَانٌ** (اژدہا) کہا جا رہا ہے۔ اس کی توجیہ امام رازی اس طرح کرتے ہیں کہ **حَيَّةٌ** عربی زبان میں سانپ کی جنس کے لیے مشترک نام ہے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور

ثُعَبَانُ کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا کہ جسامت کے اعتبار سے وہ ازدھے کی طرح تھا۔ اور **جَانٌ** کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا کہ اس کی پھرتی اور تیزی چھوٹے سانپ جیسی تھی۔

▲ سورۃ الشعراء حاشیہ نمبر: 28

بعض مفسرین نے یہودی روایات سے متاثر ہو کر **بَيْضَاءٌ** کے معنی "سفید" کیے ہیں اور اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بغل سے نکلتے ہی بھلا چنگا ہاتھ بر ص کے مریض کی طرح سفید ہو گیا۔ لیکن ابن جریر، ابن کثیر، زمخشری، رازی، ابوالسعود عمادی، آلوسی اور دوسرے بڑے بڑے مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہاں **بَيْضَاءٌ** بمعنی روش اور چمکدار ہے۔ جو نبی کہ حضرت موسیٰ نے بغل سے ہاتھ نکالا یہاں کیک سارا ماحول جگہا اٹھا اور یوں محسوس ہوا جیسے سورج نکل آیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو *تفہیم القرآن*، ط ۱۳)۔

قَالَ يَلْمَلِ حَوْلَهُ أَنَّ هَذَا لَسْحِرٌ عَلِيهِ^{٢٧} مُّرِيدُهُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِّنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرٍ فَمَا ذَا
 تَأْمُرُونَ^{٢٨} قَالُوا أَرْجِهُ وَأَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَائِنِ لَهِشِيرِينَ^{٢٩} يَا تُوكَ بِكُلِّ سَحَارٍ عَلِيهِ^{٣٠}
 فَجِيءَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتٍ يَوْمَ مَعْلُومٍ^{٣١} وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنْتُمْ مُجْتَمِعُونَ^{٣٢} لَعَلَّنَا نَتَبِعُ
 السَّحَرَةَ إِنْ كَانُوا هُمُ الْغُلَبِينَ^{٣٣} فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا إِفْرَاعُونَ أَئِنَّا لَا جُرَاحَ إِنْ كُنَّا
 نَحْنُ الْغُلَبِينَ^{٣٤} قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذَا لَمَّا الْمُقَرَّبِينَ^{٣٥} قَالَ لَهُمْ مُوسَى أَلْقُوا مَا أَنْتُمْ
 مُلْقُونَ^{٣٦} فَالْقَوَا حِبَالَهُمْ وَعِصَيَّهُمْ وَقَالُوا بِعْزَةٍ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغُلَبُونَ^{٣٧} فَالْقَى
 مُوسَى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَا فِكُونَ^{٣٨} فَالْقَى السَّحَرَةُ سَجِدِينَ^{٣٩} قَالُوا أَمَنَّا بِرَبِّ
 الْعَلِمِينَ^{٤٠} رَبِّ مُوسَى وَهَرُونَ^{٤١} قَالَ أَمَنْتُمْ لَهُ قَبْلَ أَذْنَنَكُمْ إِنَّهُ لَكَيْرُكُمْ
 الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُونَ^{٤٢} لَا قَطْعَنَ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَ
 لَا وَصْلِبَنَكُمْ أَجْمَعِينَ^{٤٣} قَالُوا لَا ضَيْرَ إِنَّا إِلَى رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ^{٤٤} إِنَّا نَطَعْ أَنْ يَغْفِرَ
 لَنَا رَبُّنَا حَطَيْنَا آنْ كُنَّا آوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ^{٤٥}

رکوء ۳

فرعون اپنے گردوبیش کے سرداروں سے بولا ”یہ شخص یقیناً ایک ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے۔ **29** اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو؟ **30**“

انہوں نے کہا ”اسے اور اس کے بھائی کو روک لیجئے اور شہروں میں ہر کارے بھج دیجئے کہ ہر سیانے جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔“

چنانچہ ایک روز مقرر وقت **31** پر جادوگر اکٹھے کر لیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا ”تم اجتماع میں چلو گے؟ **32** شاید کہ ہم جادوگروں کے دین ہی پر رہ جائیں اگر وہ غالب رہے۔ **33**“

جب جادوگر میدان میں آئے تو انہوں نے فرعون سے کہا ”ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے؟ **34**“ اس نے کہا ”ہاں، اور تم تو اس وقت مقربین میں شامل ہو جاؤ گے۔ **35**“

موسیٰ نے کہا ”پھینکو جو تمہیں پھینکنا ہے۔“

انہوں نے فوراً اپنی رسیاں اور لاطھیاں پھینک دیں اور بولے ”فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب رہیں گے۔“ **36** پھر موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو یک دن کے جھوٹے کرشمیں کو ہڑپ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور بول اٹھے کہ ”مان گئے ہم رب العالمین کو۔۔۔ موسیٰ اور ہاروں کے رب کو۔ **37**“

فرعون نے کہا ”تم موسیٰ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا! ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جاؤ و سکھایا ہے۔³⁸ اچھا، ابھی تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے، میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو شوی پر چڑھادوں گا۔³⁹“

انہوں نے جواب دیا ”کچھ پروا نہیں، ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں۔⁴⁰“

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 29 ▲

دونوں مجزوں کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ یا تو ایک لمحہ پہلے وہ اپنی رعیت کے ایک فرد کو برسر دربار رسالت کی باتیں اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتے دیکھ کر پاگل قرار دے رہا تھا (کیونکہ اس کے نزدیک ایک غلام قوم کے فرد کا اس جیسے با جبروت بادشاہ کے حضور ایسی جسارت کرنا پاگل پن کے سوا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا) اور اسے دھمکی دے رہا تھا کہ اگر تو نے میرے سوا کسی کو معبد مانا تو جیل میں سڑا سڑا کر مار دوں گا، یا اب ان نشانیوں کو دیکھتے ہی اس پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اسے اپنی بادشاہی اور اپنا ملک چھننے کا خطرہ لاحق ہو گیا اور بدحواسی میں اسے یہ بھی احساس نہ رہا کہ میں بھرے دربار میں اپنے نوکروں کے سامنے کیسی بے تنگی کر رہا ہوں۔ بنی اسرائیل جیسی دلی ہوئی قوم کے دو افراد وقت کے سب سے بڑے طاقتوں بادشاہ کے سامنے کھڑے تھے۔ کوئی لاو لشکر ان کے ساتھ نہ تھا۔ کوئی جان ان کی قوم میں نہ تھی۔ کسی بغاوت کا نام و نشان تک ملک کے کسی گوشے میں نہ تھا۔ ملک سے باہر کسی دوسری حکومت کی طاقت بھی ان کی پشت پر نہ تھی۔ اس حالت میں صرف ایک لاٹھی کا اژڈہا بنتے دیکھ کر اور ایک ہاتھ کو چمکتے دیکھ کر یا کیا اس کا چیخ اٹھنا کہ یہ دو بے سروسامان آدمی میری سلطنت کا تختہ الٹ دیں گے اور پورے حکمران طبقے کو اقتدار سے بے دخل کر دیں گے، آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کا یہ کہنا کہ یہ شخص جادو کے زور سے ایسا کر ڈالے گا، مزید بدحواسی کی دلیل ہے۔ جادو کے زور سے دنیا میں کبھی کوئی سیاسی انقلاب نہیں ہوا، کوئی ملک فتح نہیں ہوا، کوئی جنگ نہیں جیتی گئی۔ جادو گر تو اس کے اپنی ملک میں موجود تھے اور بڑے بڑے کرشمے دکھاسکتے تھے۔ مگر وہ خود جانتا تھا کہ تماشا کر کے انعام لینے سے بڑھ کر ان کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ سلطنت تو کجا، وہ بیچارے تو سلطنت کے کسی پولیس کا نسبیل کو بھی چیخ کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 30 ▲

یہ فقرہ فرعون کی مزید بدواسی کو ظاہر کرتا ہے۔ کہاں تو وہ اللہ بناء و اتحا اور یہ سب اس کے بندے تھے۔ کہاں اب اللہ صاحب مارے خوف کے بندوں سے پوچھ رہے ہیں کہ تمہارا حکم کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہا تھا کہ میری عقل تو اب کچھ کام نہیں کرتی، تم بتاؤ کہ اس خطرے کا مقابلہ میں کیسے کروں۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 31 ▲

سورا طا میں گزر چکا ہے کہ اس مقابلے کے لیے قبطیوں کی قومی عید کا دن (یوم النزیبة) مقرر کیا گیا تھا تاکہ ملک کے گوشے گوشے سے میلوں ٹھیلوں کی خاطر آنے والے سب لوگ یہ عظیم الشان "دنگل" دیکھنے کے لیے جمع ہو جائیں، اور اس کے لیے وقت بھی دن چڑھے کاٹے ہوا تھا تاکہ روز روشن میں سب کی آنکھوں کے سامنے فریقین کی طاقت کا مظاہرہ ہو اور روشنی کی کمی کے باعث کوئی شک و شبہ پیدا ہونے کی گنجائش نہ رہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 32 ▲

یعنی صرف اعلان و اشتہار ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ آدمی اس غرض کے لیے چھوڑے گئے کہ لوگوں کو اسما اکسا کریہ مقابلہ دیکھنے کے لیے لاٹیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بھرے دربار میں جو معجزات حضرت موسیٰ نے دکھائے تھے ان کی خبر عام لوگوں میں پھیل چکی تھی اور فرعون کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ اس سے ملک کے باشندے متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے اس نے چاہا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ جمع ہوں اور خود دیکھ لیں کہ لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، ہمارے ملک کا ہر جادو گر یہ کمال دکھا سکتا ہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 33 ▲

یہ فقرہ اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ جن حاضرین دربار نے حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھا تھا اور باہر جن لوگوں تک اس کی معتبر خبریں پہنچی تھیں ان کے عقیدے اپنے دین آبائی پر سے متزلزل ہوئے جا رہے تھے، اور اب ان کے دین کا دار و مدار بس اس پر رہ گیا تھا کہ کسی طرح جادو گر بھی وہ کام کر دکھائیں جو موسیٰ علیہ

السلام نے کیا ہے۔ فرعون اور اس کے احیان سلطنت اسے خود ایک فیصلہ کن مقابلہ سمجھ رہے تھے۔ ان کے اپنے بھیجے ہوئے آدمی عوام الناس کے ذہن میں یہ بات بھاتے پھرتے تھے کہ اگر جادو گر کا میا ب ہو گئے تو ہم موسیٰ کے دین میں جانے سے بچ جائیں گے ورنہ ہمارے دین و ایمان کی خیر نہیں ہے۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 34 ▲

یہ تھے وہ حامیاں دین مشرکین جو موسیٰ علیہ السلام کے حملے سے اپنے دین کو بچانے کے لیے اس فیصلہ کن مقابلے کے وقت ان پاکیزہ جذبات کے ساتھ آئے تھے کہ ہم نے پالamar لیا تو سرکار سے کچھ انعام مل جائے گا۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 35 ▲

اور یہ تھا وہ بڑے سے بڑا اجر جو ان خادمان دین و ملت کو بادشاہ وقت کے ہاں سے مل سکتا تھا۔ یعنی روپیہ پیسہ ہی نہیں ملے گا، دربار میں کرسی بھی نصیب ہو جائے گی۔ اس طرح فرعون اور اس کے ساحروں نے پہلے ہی مرحلے پر نبی اور جادو گر کا عظیم اخلاقی فرق خود کھول کر رکھ دیا۔ ایک طرف وہ حوصلہ تھا کہ بنی اسرائیل جیسی پسی ہوئی قوم کا ایک فرد دس سال تک قتل کے الزام میں روپوش رہنے کے بعد فرعون کے دربار میں درانہ آکھڑا ہوتا ہے اور دھڑکے کے ساتھ کہتا ہے کہ میں اللہ رب العالمین کا بھیجا ہوا ہوں، بنی اسرائیل کو میرے حوالے کر۔ فرعون سے دو بد و بحث کرنے میں ادنیٰ سی جھجک بھی محسوس نہیں کرتا۔ اس کی دھمکیوں کو وہ پر کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا۔ دوسری طرف یہ کم حوصلگی ہے کہ اسی فرعون کے ہاں باپ دادا کے دین کو بچانے کی خدمت پر بلائے جا رہے ہیں، پھر بھی ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ سرکار، کچھ انعام تو مل جائے گانا؟ اور جواب میں یہ سن کر پھولے نہیں سماتے کہ پیسہ بھی ملے گا اور قرب شاہی سے بھی سرفراز کیے جائیں گے۔ یہ دو مقابل کے کردار آپ سے آپ ظاہر کر رہے تھے کہ نبی کس شان کا انسان ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں جادو گروں کی کیا ہستی ہوتی ہے۔ جب تک کوئی شخص بے حیائی کی ساری حدود کو نہ پھاند جائے، وہ نبی کو جادو گر کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 36 ▲

یہاں یہ ذکر چھوڑ دیا ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان سے یہ فقرہ سنتے ہی جب جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاثھیاں پھینکیں تو یکایک وہ بہت سے سانپوں کی شکل میں حضرت موسیٰ کی طرف لپکتی نظر آئیں۔ اس کی تفصیل قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہو چکی ہے۔ سورہ اعراف میں ہے **فَلَمَّا آتُقُوْا سَحْرًا**
أَعْيُّنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَاءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ۲۶ جب انہوں نے اپنے انچھرے پھینکے تو لوگوں کی آنکھوں کو مسحور کر دیا، سب کو دہشت زدہ کر کے رکھ دیا، اور بڑا بھاری جادو بنالائے۔ سورہ طہ میں اس وقت کا نقشہ یہ کھینچا گیا ہے کہ **فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيْهِمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَى** ۲۷ **فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيَفَةً مُّوسَى** یکایک ان کے سحر سے حضرت موسیٰ کو یوں محسوس ہوا کہ ان کی رسیاں اور لاثھیاں دوڑی چلی آرہی ہیں، اس سے موسیٰ علیہ السلام اپنے دل میں ڈر سے گئے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 37 ▲

یہ حضرت موسیٰ کے مقابلے میں ایک طرف سے محض شکست کا اعتراف نہیں تھا کہ کوئی شخص یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتا کہ ایک بڑے جادوگرنے چھوٹے جادوگروں کو نیچا دکھا دیا، بلکہ ان کا سجدے میں گر کر اللہ رب العالمین پر ایمان لے آنا گویا بر سر عام ہزار ہابا شند گان مصر کے سامنے اس بات کا اور اعلان تھا کہ موسیٰ جو کچھ لائے ہیں یہ ہمارے فن کی چیز ہی نہیں ہے، یہ کام تو صرف اللہ رب العالمین ہی کی قدرت سے ہو سکتا ہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 38 ▲

یہاں چونکہ سلسلہ کلام کی مناسبت سے صرف یہ دکھانا ہے کہ ایک ضدی اور ہٹ دھرم آدمی کس طرح ایک صریح معجزہ دیکھ کر، اور اس کے معجزہ ہونے پر خود جادوگروں کی شہادت سن کر بھی اسے جادو کہے جاتا ہے، اس لیے فرعون کا صرف اتنا ہی فقرہ نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے، لیکن سورہ اعراف میں تفصیل کے ساتھ یہ

بتایا گیا ہے کہ فرعون نے بازی ہارتی دیکھ کر فوراً ہی ایک سیاسی سازش کا افسانہ گھڑ لیا۔ اس نے کہا **إِنَّ هُنَّا**

لَئِكْرُ مَكْرُ تُمُواهٌ فِي الْمَدِينَةِ لِتُخْرِجُوا مِنْهَا آهُلَهَا" یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے مل کر اس دارالسلطنت میں تیار کی ہے تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو"۔ اس طرح فرعون نے عام الناس کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ جادوگروں کا یہ ایمان مجذبے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ محض ملی بھگت ہے، یہاں آنے سے پہلے ان کے اور موسیٰؐ کے درمیان معاملہ طے ہو گیا تھا کہ یوں وہ موسیٰؐ کے مقابلے میں آ کر شکست کھائیں گے، اور نتیجے میں جو سیاسی انقلاب ہو گا اس کے مزے وہ اور یہ مل کر لوٹیں گے۔

▲ سورۃ الشعراء حاشیہ نمبر: 39

یہ خوفناک دھمکی فرعون نے اپنے اس نظریے کو کامیاب کرنے کے لیے دی تھی کہ جادوگر دراصل موسیٰؐ علیہ السلام کے ساتھ سازش کر کے آئے ہیں۔ اس کے پیش نظر یہ تھا کہ اس طرح یہ لوگ جان بچانے کے لیے سازش کا اعتراف کر لیں گے اور وہ ڈرامائی اثر کافور ہو جائے گا جو شکست کھاتے ہی ان کے سجدے میں گر کر ایمان لے آنے سے ان ہزارہانا ناظرین پر مترتب ہوا تھا جو خود اس کی دعوت پر یہ فیصلہ کن مقابلہ دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے اور جنہیں خود اس کے بھیجے ہوئے لوگوں نے یہ خیال دلا�ا تھا کہ مصری قوم کا دین وایمان بس ان جادوگروں کے سہارے لٹک رہا ہے، یہ کامیاب ہوں تو قوم اپنے دین آبائی پر قائم رہ سکے گی ورنہ موسیٰؐ کی دعوت کا سیلا ب اسے اور اس کے ساتھ فرعون کی سلطنت کو بھی بہالے جائے گا۔

▲ سورۃ الشعراء حاشیہ نمبر: 40

یعنی ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا تو بہر حال ایک نہ ایک دن ضرور ہے۔ اب اگر تو قتل کر دے گا تو اس سے زیادہ کچھ نہ ہو گا کہ وہ دن جو کبھی آنا تھا، آج آجائے گا۔ اس صورت میں ڈرنے کا کیا سوال؟ ہمیں تو الٹی

مغفرت اور خطا بخشی کی امید ہے کیونکہ آج اس جگہ حقیقت کھلتے ہی ہم نے مان لینے میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہ کی اور اس پورے مجمع میں سب سے پہلے پیش قدمی کر کے ہم ایمان لے آئے۔
جادو گروں کے اس جواب نے دو باتیں تمام اس خلقت کے سامنے واضح کر دیں جسے فرعون نے ڈھنڈوڑے پیٹ پیٹ کر جمع کیا تھا۔

اول یہ کہ فرعون نہایت جھوٹا، ہٹ دھرم اور مکار ہے۔ جو مقابلہ اس نے خود فیصلے کے لیے کرایا تھا اس میں موسیٰ علیہ السلام کی کھلی کھلی فتح کو سیدھی طرح مان لینے کے بجائے اور اس نے فوراً ایک جھوٹی سازش کا افسانہ گھٹر لیا اور قتل و تعصیب کی دھمکی دے کر زبردستی اس کا اقرار کرانے کی کوشش کی۔ اس افسانے میں ذرہ برابر بھی کوئی صداقت ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ جادو گر ہاتھ پاؤں کٹوانے اور سولی پر چڑھ جانے کے لیے یوں تیار ہو جاتے۔ ایسی کسی سازش سے اگر کوئی سلطنت مل جانے کا لائق تھا تو اب اس کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، کیونکہ سلطنت کے مزے توجلوں گا سولوں گا، ان غریبوں کے حصے میں تو صرف کٹ کٹ کٹ کر جان دینا ہی رہ گیا ہے۔ اس ہولناک خطرے کو انگیز کر کے بھی ان جادو گروں کا اپنے ایمان پر قائم رہنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ سازش کا الزام سراسر جھوٹا ہے اور سچی بات یہی ہے کہ جادو گر اپنے فن میں ماہر ہونے کی وجہ سے ٹھیک ٹھیک جان گئے ہیں کہ جو کچھ موسیٰ علیہ السلام نے دکھایا ہے وہ ہرگز جادو نہیں ہے بلکہ واقعی اللہ رب العالمین ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

دوسری بات جو اس وقت ملک کے گوشے گوشے سے سمٹ کر آئے ہوئے ہزارہا آدمیوں کے سامنے کھل کر آئی وہ یہ تھی کہ اللہ رب العالمین پر ایمان لاتے ہی ان جادو گروں میں کیسا زبردست اخلاقی انقلاب واقع ہو گیا۔ کہاں تو ان کی پسستی ذہن و فکر کا یہ حال تھا کہ دین آبائی کی نصرت کے لیے آئے تھے اور فرعون کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر انعام مانگ رہے تھے، اور کہاں اب آن کی آن میں ان کی بلندی ہمت و عزم اس درجے کو پہنچ گئی کہ

وہی فرعون ان کی نگاہ میں بیچ ہو گیا، اس کی بادشاہی کی ساری طاقت کو انہوں نے ٹھوکر مار دی اور اپنے ایمان کی خاطر وہ موت اور بدترین جسمانی تغذیب تک برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سے بڑھ کر مصریوں کے دین شرک کی تذلیل اور موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین حق کی موثر تبلیغ اس نازک نفسیاتی موقع پر شاید ہی کوئی اور ہو سکتی تھی۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَى مُوسَى أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي إِنَّكُمْ مُتَّبِعُونَ ﴿٥٢﴾ فَارْسَلَ فِرْعَوْنَ فِي الْمَدَائِنِ
حَشِيرِينَ ﴿٥٣﴾ إِنَّهُؤُلَاءِ لَشِرْدَمَةٌ قَلِيلُونَ ﴿٥٤﴾ وَإِنَّهُمْ لَنَا لَغَآءٌ طُوبُونَ ﴿٥٥﴾ وَإِنَّا كَجِيمُّ حَذِرُونَ
فَأَخْرَجَنُّهُمْ مِنْ جَنَّتِهِ وَعُيُونٍ ﴿٥٦﴾ وَكُنُوزٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ﴿٥٧﴾ كَذِلِكَ طَوْبَانٌ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِيَّ
إِسْرَارَ آعِيَّلَ ﴿٥٨﴾ فَاتَّبَعُوهُمْ مُشْرِقِينَ ﴿٥٩﴾ فَلَمَّا تَرَأَءَ الْجَمْعُونَ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَى إِنَّا لَمُدَرَّكُونَ
قَالَ كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيِّهُدِيَّنَ ﴿٦٠﴾ فَأَوْحَيْنَا إِلَى مُوسَى أَنِ اضْرِبْ بِعَصَالَكَ الْبَحْرَ
فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالْطَّوْدِ الْعَظِيمِ ﴿٦١﴾ وَأَزْلَفْنَا ثُمَّ الْأَخْرِيَّنَ ﴿٦٢﴾ وَأَنْجَيْنَا مُوسَى وَمَنْ
مَعَهُ أَجْمَعِينَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْأَخْرِيَّنَ ﴿٦٤﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَاءَةً طَوْبَانٌ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ
مُؤْمِنِينَ ﴿٦٥﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٦٦﴾

دکوع ۲

“**41** ہم نے موسیٰ کو وحی بھیجی کہ ”راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نقل جاؤ، تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔ **42**“ اس پر فرعون نے **43** فوجیں جمع کرنے کے لیے شہروں میں نقیب بھیج دیے **44** اور کہلا بھیجا کہ ”یہ کچھ مُٹھی پھر لوگ ہیں، اور انہوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے، اور ہم ایک ایسی جماعت ہیں جس کا شیوه ہر وقت چوکنا رہنا ہے۔ **45**“ اس طرح ہم انہیں ان کے باغوں اور چشموں اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے نکال لائے۔ **46** یہ تو ہواں کے ساتھ، اور **47** دوسری طرف بی اسرائیل کو ہم نے ان سب چیزوں کا وارث کر دیا۔

صحیح ہوتے یہ لوگ اُن کے تعاقب میں چل پڑے۔ جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو موسیٰ کے ساتھی چن اٹھے کہ ہم تو کپڑے گئے۔ موسیٰ نے کہا ”ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب ہے۔ وہ ضرور میرے رہنمائی فرمائے گا۔ **48**“ ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ ”مار اپنا عصا سمندر پر۔“ یک ایک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر طکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔ **49** اُسی جگہ ہم دوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے۔ **50** موسیٰ اور اُن سب لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے، ہم نے بچالیا، اور دوسروں کو غرق کر دیا۔

اس واقعہ میں ایک نشانی ہے **51**، مگر ان لوگوں میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ۶۴

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 41 ▲

اوپر کے واقعات کے بعد ہجرت کا ذکر شروع ہو جانے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس کے بعد بس فوراً ہی حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل سمیت مصر سے نکل جانے کے احکام دے دیے گئے۔ دراصل یہاں کئی سال کی تاریخ پیچ میں چھوڑ دی گئی ہے جسے سورہ عرافہ کو ۱۵-۱۶، اور سورہ یونس کو ۹ میں بیان کیا جا چکا ہے، اور جس کا ایک حصہ آگے سورہ مومن کو ۲-۵ اور الزُّخْرُف کو ۵ میں آ رہا ہے۔ یہاں چونکہ سلسلہ کلام کی مناسبت سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جس فرعون نے صریح نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود یہ ہٹ دھرمی دکھائی تھی اس کا انعام آخر کار کیا ہوا۔ اور جس دعوت کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت تھی وہ کس طرح کامیابی سے ہمکنار ہوئی، اس لیے فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی کشمکش کے ابتدائی مرحلے کا ذکر کرنے کے بعد اب قصہ مختصر کر کے اس کا آخری منظر دکھایا جا رہا ہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 42 ▲

واضح رہے کہ بنی اسرائیل کی آبادی مصر میں کسی ایک جگہ مجتمع نہ تھی بلکہ ملک کے تمام شہروں اور بستیوں میں بٹی ہوئی تھی اور خصوصیت کے ساتھ منف (Memphis) سے رَعْمیسْ تک اس علاقے میں ان کی بڑی تعداد آباد تھی جسے جشن کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا (ملاحظہ ہو "نقشہ خروج بنی اسرائیل" ، تفہیم القرآن جلد دوم، صفحہ 76)۔ لہذا حضرت موسیٰؑ کو جب حکم دیا گیا ہو گا کہ اب تمہیں بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جانا ہے تو انہوں نے بنی اسرائیل کی تمام بستیوں میں ہدایات بھیج دی ہوں گی کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ ہجرت کے لیے تیار ہو جائیں، اور ایک خاص رات مقرر کر دی ہو گی کہ اس رات ہر بستی کے مہاجرین نکل کھڑے ہوں۔ یہ ارشاد کہ "تمہارا پیچھا کیا جائے گا" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہجرت کے لیے رات

کو نکلنے کی ہدایت کیوں کی گئی تھی۔ یعنی قبل اس کے کہ فرعون لشکر لے کر تمہارے تعاقب میں نکلے تم راتوں رات اپناراستہ اس حد تک طے کر لو کہ اس سے بہت آگے نکل چکے ہو۔

▲ سورۃ الشعرا، حاشیہ نمبر: 43

یہ باتیں فرعون کی اس چھپی ہوئی خوف زدگی کو ظاہر کرتی ہیں جس پر وہ بے خوفی کا نمائشی پر دہ ڈال رہا تھا۔ ایک طرف وہ جگہ جگہ سے فوجیں بھی فوری امداد کے لیے بلا رہا تھا جو اس بات کی کھلی علامت تھی کہ اسے بنی اسرائیل سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ دوسری طرف وہ اس بات کو چھپانا بھی چاہتا تھا کہ مدت ہائے دراز کی دبی اور پسی ہوئی قوم، جو انتہائی ذلت کی غلامی میں زندگی بسر کر رہی تھی، اس سے فرعون جیسا قاہر فرمائیں روا کوئی خطرہ محسوس کر رہا ہے حتیٰ کہ اسے فوری امداد کے لیے فوجیں طلب کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ اس لیے وہ اپنا پیغام اس انداز میں بھجتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل بیچارے چیزی کیا ہیں، کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں جو ہمارا بال بھی بیگا نہیں کر سکتے، لیکن انہوں نے ایسی حرکتیں کی ہیں کہ ہمیں ان پر غصہ آگیا ہے اس لیے ہم انہیں سزا دینا چاہتے ہیں، اور فوجیں ہم کسی خوف کی وجہ سے جمع نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ صرف ایک احتیاطی کارروائی ہے، ہماری دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ کوئی بعید سے بعید بھی امکانی خطرہ ہو تو ہم بر وقت اس کی سر کوبی کرنے کے لیے تیار رہیں۔

▲ سورۃ الشعرا، حاشیہ نمبر: 44

یعنی فرعون نے تو یہ کام اپنے نزدیک بڑی عقلمندی کا کیا تھا کہ دور دور سے فوجیں طلب کر کے بنی اسرائیل کو دنیا سے مٹا دینے کا سامان کیا، لیکن خدائی تدبیر نے اس کی چال اس پر یوں الٹ دی کہ دولت فرعونیہ کے بڑے بڑے ستون اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر اس جگہ جا پہنچے جہاں انہیں اور ان کے سارے لاو لشکر کو ایک ساتھ غرق ہونا تھا۔ اگر وہ بنی اسرائیل کا پیچھا نہ کرتے تو نتیجہ صرف اتنا ہی ہوتا کہ ایک قوم ملک چھوڑ کر نکل جاتی۔ اس سے بڑھ کر ان کا کوئی نقصان نہ ہوتا اور وہ حسب سابق اپنے عیش کدوں میں بیٹھے زندگی کے مزے لوٹتے

رہتے۔ لیکن انہوں نے کمال درجہ کی ہوشیاری دکھانے کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسرائیل کو بخیریت نہ گزر جانے دیں بلکہ ان کے مہاجر قافلوں پر یک بارگی حملہ کر کے ہمیشہ کے لیے ان کا قلع قمع کر دیں۔ اس غرض کے لیے ان کے شہزادے اور بڑے بڑے سردار اور اعیان سلطنت خود بادشاہ ذی جاہ سمیت اپنے محلوں سے نکل آئے، اور اسی دنائی نے یہ دوہر انتیجہ دکھایا کہ بنی اسرائیل مصر سے نکل بھی گئے اور مصر کی ظالم فرعونی سلطنت کا مکھن نذر دریا بھی ہو گیا۔

سورة الشعرااء حاشیہ نمبر: 45 ▲

بعض مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ جن باغوں، چشموں، خزانوں اور بہترین قیام گاہوں سے یہ ظالم لوگ نکلے تھے ان ہی کا وارث اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کر دیا۔ یہ مطلب اگر لیا جائے تو اس کے معنی لازماً یہ ہونے چاہیں کہ فرعون کے غرق ہو جانے پر بنی اسرائیل پھر مصر والپس پہنچ گئے ہوں اور آل فرعون کی دولت و حشمت ان کے قبضے میں آگئی ہو۔ لیکن یہ چیز تاریخ سے بھی ثابت نہیں ہے اور خود قرآن مجید کی دوسری تصریحات سے بھی اس آیت کا یہ مفہوم مطابقت نہیں رکھتا۔ سورہ بقرہ، سورہ مائدہ، سورہ اعراف اور سورہ طہ میں جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل مصر کی طرف پلٹنے کے بجائے اپنی منزل مقصود (فلسطین) ہی کی طرف آگے روانہ ہو گئے اور پھر حضرت داؤد کے زمانے (973ق م، 1013ق م) تک ان کی تاریخ میں جو واقعات بھی پیش آئے وہ سب اس علاقے میں پیش آئے جو آج جزیرہ نما ہے سینا، شمالی عرب، شرق اردن اور فلسطین کے ناموں سے موسوم ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہی باغ اور چشمے اور خزانے اور محلات بنی اسرائیل کو بخش دیے جن سے فرعون اور اس کی قوم کے سردار اور امراء نکالے گئے تھے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف آل فرعون کو ان نعمتوں سے محروم کیا اور دوسری طرف بنی

اسرائیل کو یہی نعمتیں عطا فرمادیں، یعنی وہ فلسطین کی سر زمین میں باغوں، چشمتوں، خزانوں اور عمدہ قیام گا ہوں کے مالک ہوئے۔ اسی مفہوم کی تائید سورہ اعراف کی یہ آیت کرتی ہے **فَإِنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرِقْنَاهُمْ فِي الْأَيْمَمِ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِأَيْتَنَا وَ كَانُوا عَنْهَا غَفِيلِينَ** ﴿١٣٣﴾ وَ أَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعِفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا^۶، (آیات 136-137)۔ "تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلا یا تھا اور ان سے بے پرواہ گئے تھے۔ اور ان کے بجائے ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنایا کر رکھے گئے تھے اس ملک کے مشرق و مغرب کا وارث بنایا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا"۔ یہ برکتوں سے مالا مال سر زمین کا استعارہ قرآن مجید میں عموماً فلسطین ہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور کسی علاقے کا نام لیے بغیر جب اس کی یہ صفت بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہی علاقہ مراد ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا **إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ**۔ اور سورہ انبیاء میں ارشاد ہوا **وَنَجِّنْدَهُ وَلُوطَأَ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَلَمِينَ** اور **وَلِسُلَيْمَنَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا**۔ اسی طرح سورہ سباء میں بھی **أَلْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا** کے الفاظ سر زمین شام و فلسطین ہی کی بستیوں کے متعلق استعمال ہوئے ہیں۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 46
یعنی مجھے اس آفت سے بچنے کی راہ بتائے گا۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 47 ▲

اصل الفاظ ہیں **كَالْطُودُ الْعَظِيمُ۔ طُود** عربی زبان میں کہتے ہی بڑے پھاڑ کو ہیں۔ لسان العرب میں ہے **الْطُودُ، الْجَبْلُ الْعَظِيمُ**۔ اس کے لیے بھر عظیم کی صفت لانے کے معنی یہ ہوئے کہ پانی دونوں طرف بہت اونچے پھاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ سمندر حضرت موسیٰؐ کے عصا مارنے سے پھٹا تھا، اور یہ کام ایک طرف بنی اسرائیل کے پورے قافلے کو گزارنے کے لیے کیا گیا تھا اور دوسری طرف اس سے مقصود فرعون کے لشکر کو غرق کرنا تھا، تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عصا کی ضرب لگنے پر پانی نہایت بلند پھاڑوں کی شکل میں کھڑا ہو گیا اور اتنی دیر تک کھڑا رہا کہ ہزاروں لاکھوں بنی اسرائیل کا مہاجر قافلہ اس میں سے گزر بھی گیا اور پھر فرعون کا پورا لشکر ان کے درمیان پہنچ بھی گیا۔ ظاہر ہے کہ عام قانون فطرت کے تحت جو طوفانی ہوانیں چلتی ہیں وہ خواہ کیسی ہی تند و تیز ہوں، ان کے اثر سے کبھی سمندر کا پانی اس طرح عالی شان پھاڑوں کی طرح اتنی دیر تک کھڑا نہیں رہا کرتا۔ اس پر مزید سورہ طاطا کا یہ بیان ہے کہ **فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبْسَأً** "ان کے لیے سمندر میں سوکھا راستہ بنادے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سمندر پر عصا مارنے سے صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ سمندر کا پانی ہٹ کر دونوں طرف پھاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا، بلکہ نیچے میں جو راستہ نکلا وہ خشک بھی ہو گیا، کوئی یکچھ ایسی نہ رہی جو چلنے میں مانع ہوتی۔ اس کے ساتھ سورہ دخان آیت 24 کے یہ الفاظ بھی قابل غور ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؐ کو ہدایت فرمائی کہ سمندر پار کر لینے کے بعد "اس کو اسی حال پر رہنے دے، لشکر فرعون یہاں غرق ہونے والا ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؐ اگر دوسرے ساحل پر پہنچ کر سمندر پر عصا مار دیتے تو دونوں طرف کھڑا ہوا پانی پھر مل جاتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا تاکہ لشکر فرعون اس راستے میں اتر آئے اور پھر پانی دونوں طرف سے آکر اسے غرق کر دے۔ یہ صریحاً ایک م مجرزے کا بیان ہے اور اس سے ان لوگوں کے خیال

کی غلطی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو اس واقع کی تعبیر عام قوانین فطرت کے تحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، طا، حاشیہ 53)۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 48 ▲

یعنی فرعون اور اس کے شکر کو۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 49 ▲

یعنی قریش کے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ ہٹ دھرم لوگ کھلے کھلے مجرمات دیکھ کر بھی کس طرح ایمان لانے سے انکار ہی کیے جاتے ہیں اور پھر اس ہٹ دھرم کی انجام کیسا دردناک ہوتا ہے۔ فرعون اور اس کی قوم کے تمام سرداروں اور ہزارہا شکریوں کی آنکھوں پر ایسی پٹی بندھی ہوتی تھی کہ سالہا سال تک جو نشانیاں ان کو دکھائی جاتی رہیں ان کو تو وہ نظر انداز کرتے ہی رہے تھے، آخر میں عین غرق ہونے کے وقت بھی ان کو یہ نہ سو جھا کہ سمندر اس قافلے کے لیے پھٹ گیا ہے، پانی پہاڑوں کی طرح دونوں طرف کھڑا ہے اور پیچ میں سو کھی سڑک سی بنی ہوتی ہے۔ یہ صریح علامتیں دیکھ کر بھی ان کو عقل نہ آئی کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خدائی طاقت کام کر رہی ہے اور وہ اس طاقت سے لڑنے جا رہے ہیں۔ ہوش ان کو آیا بھی تو اس وقت جب پانی نے دونوں طرف سے ان کو دبوج لیا تھا اور وہ خدا کے غضب میں گھر چکے تھے۔ اس وقت فرعون پیچ اٹھا کہ **أَمَّنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ إِلَّا إِنَّمَّا أَمَّنْتُ بِهِ بَنُوَ إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ** (یونس۔ آیت ۹۰)

دوسری طرف اہل ایمان کے لیے بھی اس میں یہ نشانی ہے کہ ظلم اور اس کی طاقتیں خواہ بظاہر کیسی ہی چھائی ہوتی نظر آتی ہوں، آخر کار اللہ تعالیٰ کی مدد سے حق کا یوں بول بالا ہوتا ہے اور باطل اس طرح سرگوں ہو کر رہتا ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأً إِبْرَاهِيمَ ﴿١٩﴾ إِذْ قَالَ لِآبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٢٠﴾ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَّلَ لَهَا
عَكْفِينَ ﴿٢١﴾ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَ كُمْ إِذْ تَدْعُونَ ﴿٢٢﴾ أَوْ يَنْفَعُونَ كُمْ أَوْ يَضْرُونَ ﴿٢٣﴾ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا
كَذِيلَكَ يَفْعَلُونَ ﴿٢٤﴾ قَالَ أَفَرَءَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٢٥﴾ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ ﴿٢٦﴾ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ
لِّلَّا رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٢٧﴾ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِيَنِ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِيَنِ ﴿٢٩﴾ وَإِذَا مَرِضْتُ
فَهُوَ يَشْفِيَنِ ﴿٣٠﴾ وَالَّذِي يُمْسِيَنِ شَرَّ مُحْسِنِينَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِي أَطْبَعَ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ﴿٣٢﴾
رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَحْقَنِي بِالصَّالِحِينَ ﴿٣٣﴾ وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صَدِيقٍ فِي الْأَخْرِيَنَ ﴿٣٤﴾ وَاجْعَلْنِي مِنْ
وَرَثَةَ جَنَّةِ النَّعِيمِ ﴿٣٥﴾ وَاغْفِرْ لَأِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ﴿٣٦﴾ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبَعَثُونَ ﴿٣٧﴾ يَوْمَ لَا
يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُوْنَ ﴿٣٨﴾ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٣٩﴾ وَأَرْلَفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٤٠﴾ وَبَرِّزَتِ
الْجَحِيْمُ لِلْغَوِيْنَ ﴿٤١﴾ وَقِيلَ لَهُمْ آيَنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٤٢﴾ مِنْ دُونِ اللَّهِ هَلْ يَنْصُرُونَ كُمْ أَوْ
يَنْتَصِرُونَ ﴿٤٣﴾ فَكُبِّكُبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوَنَ ﴿٤٤﴾ وَجُنُودُ ابْلِيسَ أَجْمَعُونَ ﴿٤٥﴾ قَالُوا وَهُمْ فِيهَا
يَخْتَصِسُونَ ﴿٤٦﴾ تَالَّهِ إِنْ كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٤٧﴾ إِذْ نُسُوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٨﴾ وَمَا آَضَلَنَا إِلَّا
الْمُجْرِمُونَ ﴿٤٩﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ ﴿٥٠﴾ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ ﴿٥١﴾ فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ
الْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٢﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿٥٣﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ

دکو ۵

اور انہیں ابراہیمؑ کا قصہ سناؤ **50** جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ ”یہ کیا چیزیں ہیں جن کو تم پوچھتے ہو؟ **51**“ انہوں نے جواب دیا ”کچھ بُت ہیں جن کی ہم پوچھ سکتے ہیں اور انہی کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں۔ **52**“ اس نے پوچھا ”کیا یہ تمہاری سُنْتَ ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو؟ یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟“ انہوں نے جواب دیا ”نہیں، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ **53**“ اس پر ابراہیمؑ نے کہا ”کبھی تم نے آنکھیں کھول کر کھلائے اُن چیزوں کو دیکھا بھی جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا بجا لاتے رہے؟ **54** میرے تو یہ سب دشمن ہیں **55**، بجز ایک رب العالمین **56** کے، جس نے مجھے پیدا کیا **57**، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلا تا اور پڑلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفادیتا ہے۔ **58** جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشدے گا۔ اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں وہ میری خطاب معاف فرمادے گا۔ **59**

﴿ اس کے بعد ابراہیمؑ نے دُعا کی ﴿ ”اے میرے رب، مجھے حکم عطا کر۔ **60** اور مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا۔ **61** اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر۔ **62** اور مجھے جنتِ نعیم کے وارثوں میں شامل فرم۔ اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے **63** اور مجھے اُس دن رُسوانہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے **64** جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلبِ سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔ **65**”

﴿ اس روز **66** جنت پر ہیز گاروں کے قریب لے آئی جائے گی۔ اور دوزخ بہکے ہوئے لوگوں کے سامنے کھول دی جائے گی **67** اور ان سے پوچھا جائے گا کہ ”اب کہاں ہیں وہ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت

کرتے تھے؟ کیا وہ تمہاری کچھ مدد کر رہے ہیں یا خود اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں؟“ پھر وہ معبدوں اور یہ بہکے ہوئے لوگ، اور ابليس کے لشکر سب کے سب اس میں اوپر تلے دھکیل دیے جائیں گے۔ **68** وہاں یہ سب آپس میں جھگڑیں گے اور یہ بہکے ہوئے لوگ **69** اپنے معبدوں سے کہیں گے کہ ”خدا کی قسم، ہم تو صریح گمراہی میں مبتلا تھے جبکہ تم کو رب العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے۔ اور وہ مجرم لوگ ہی تھے جنہوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا۔ **70** اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے **71** اور نہ کوئی جگری دوست۔ **72** کاش ہمیں ایک دفعہ پھر پلنے کا موقع مل جائے تو ہم مومن ہوں۔ **73**

یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے **73**، مگر ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ **74**

▲ سورہ الشعراء حاشیہ نمبر: 50

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ کے اس دور کا قصہ بیان ہوا ہے جبکہ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد شرک و توحید کے مسئلے پر آپ کی اپنے خاندان اور اپنی قوم سے کشمکش شروع ہوئی تھی۔ اس دور کی تاریخ کے مختلف گوشے قرآن مجید میں حسب ذیل مقامات پر بیان ہوئے ہیں: البقرہ رکوع 35۔ الانعام رکوع 9۔ مریم رکوع 3۔ الانبیاء رکوع 5۔ الصَّفَر رکوع 3۔ المختنہ رکوع 1)۔

سیرت ابراہیم کے اس دور کی تاریخ خاص طور پر جس وجہ سے قرآن مجید بار بار سامنے لاتا ہے وہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ بالعموم اور قریش بالخصوص اپنے آپ کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا پیر و سمجھتے اور کہتے تھے اور یہ دعویٰ رکھتے تھے کہ ملت ابراہیم ہی ان کا مذہب ہے۔ مشرکین عرب کے علاوہ نصاریٰ اور یہود کا بھی یہ دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے دین کے پیشواؤں ہیں۔ اس پر قرآن مجید جگہ جگہ ان لوگوں کو متنبہ کرتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جو دین لے کر آئے تھے وہ یہی خالص اسلام تھا جسے نبی عربی محمد ﷺ لائے ہیں اور جس سے آج تم لوگ بر سر پیکار ہو۔ وہ مشرک نہ تھے بلکہ ان کی ساری لڑائی شرک ہی کے خلاف تھی اور اسی لڑائی کی بدولت انہیں اپنے باپ، خاندان، قوم، وطن سب کو چھوڑ کر شام و فلسطین اور حجاز میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی تھی۔ اسی طرح وہ یہودی و نصرانی بھی نہ تھے بلکہ یہود و نصاریٰ کے پاس، کیونکہ بعد وجود میں آئیں۔ اس تاریخی استدلال کا کوئی جواب نہ مشرکین کے پاس تھا نہ یہود و نصاریٰ کے پاس، کیونکہ مشرکین کو بھی یہ تسلیم تھا کہ عرب میں بتوں کی پرستش حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کئی صدی بعد شروع ہوئی تھی، اور یہود و نصاریٰ بھی اس سے انکار نہ کر سکتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ یہودیت اور عیسائیت کی پیدائش سے بہت پہلے تھا۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ جن مخصوص عقائد اور اعمال پر یہ لوگ اپنے دین کا مدار رکھتے ہیں وہ اس دین قدیم کے اجزاء نہیں ہیں جو ابتداء سے چلا آرہا تھا، اور صحیح دین وہی

ہے جو ان آمیز شوں سے پاک ہو کر خالص خدا پرستی پر مبنی ہو۔ اسی بنیاد پر قرآن کہتا ہے:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصَارَائِيًّا وَلِكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ
إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ تَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوهُ وَهُدًى النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ أَمْنُوا ﴿٦٧﴾ (آل عمران۔

آیات 67-68)۔

ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا۔ اور وہ مشرکوں میں سے بھی نہ تھا۔ درحقیقت ابراہیم علیہ السلام سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق ان ہی لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کے طریقے کی پیروی کی (اور اب یہ حق) اس نبی اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو (پہنچتا ہے)۔

▲ سورۃ الشعراء حاشیہ نمبر: 51

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کا مدعایہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، کیونکہ ان بتوں کو تو وہ خود بھی دیکھ رہے تھے جن کی پرستش وہاں ہوتی تھی۔ ان کا مداراصل ان لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنا تھا کہ ان معبودوں کی حقیقت کیا ہے جن کے آگے وہ سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اسی سوال کو سورہ انبیاء میں بایں الفاظ نقل کیا گیا ہے۔ " یہ کیسی مورتیں ہیں جن کے تم گرویدہ ہو رہے ہو؟"

▲ سورۃ الشعراء حاشیہ نمبر: 52

یہ جواب بھی محض یہ خبر دینے کے لیے نہ تھا کہ ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں، کیونکہ سائل و مسئول دونوں کے سامنے یہ امر واقعہ عیاں تھا۔ اس جواب کی اصل روح اپنے عقیدے پر ان کا ثبات اور اطمینان تھا۔ گویا دراصل وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ہاں، ہم بھی جانتے ہیں کہ یہ لکڑی اور پتھر کے بت ہیں جن کی ہم پوجا کر رہے ہیں، مگر ہمارا دین وایمان یہی ہے کہ ہم ان کی پرستش اور خدمت میں لگے رہیں۔

▲ سورۃ الشعراء حاشیہ نمبر: 53

یعنی ہماری اس عبادت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ ہماری مناجاتیں اور دعائیں اور فریادیں سنتے ہیں یا ہمیں نفع اور نقصان پہنچاتے ہیں اس لیے ہم نے ان کو پوجنا شروع کر دیا ہے، بلکہ اصل وجہ اس عبادت کی یہ ہے کہ باپ دادا کے وقت سے یوں ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس طرح انہوں نے خود یہ اعتراف کر لیا کہ ان کے مذہب کے لیے باپ دادا کی اندھی تقلید کے سوا کوئی سند نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ آخر تم نئی بات ہمیں کیا بتانے چلے ہو؟ کیا ہم خود نہیں دیکھتے کہ یہ لکڑی اور پتھر کی مورتیں ہیں؟ کیا ہم نہیں جانتے کہ لکڑیاں سننا نہیں کرتیں اور پتھر کسی کا کام بنانے یا بگاڑنے کے لیے نہیں اٹھا کرتے؟ مگر یہ ہمارے بزرگ جو صدیوں سے نسل بعد نسل ان کی پوجا کرتے چلے آ رہے ہیں تو کیا وہ سب تمہارے نزدیک بے وقوف تھے؟ ضرور کوئی وجہ ہو گی کہ وہ ان بے جان مورتیوں کی پوجا کرتے رہے۔ لہذا ہم بھی ان کے اعتماد پر یہ کام کر رہے ہیں۔

▲ سورۃ الشعراء حاشیہ نمبر: 54

یعنی کیا ایک مذہب کی صداقت کے لیے بس یہ دلیل کافی ہے کہ وہ باپ دادا کے وقت سے چلا آ رہا ہے؟ کیا نسل پر نسل بس یوں ہی آنکھیں بند کر کے مکھی پر مکھی مارتی چلی جائے اور کوئی آنکھیں کھول کر نہ دیکھے کہ جن کی بندگی ہم بجالا رہے ہیں ان کے اندر واقعی خدائی کی کوئی صفت پائی بھی جاتی ہے یا نہیں اور وہ ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے کچھ اختیارات رکھتے بھی ہیں یا نہیں؟

▲ سورۃ الشعراء حاشیہ نمبر: 55

یعنی میں جب غور کرتا ہوں تو مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں ان کی پرستش کروں گا تو میری دنیا و آخرت دونوں بر باد ہو جائیں گی۔ میں ان کی عبادت کو محض بے نفع اور بے ضرر ہی نہیں سمجھتا بلکہ اللئا نقصان وہ سمجھتا ہوں، اس لیے میرے نزدیک تو ان کو پوجنا دشمن کو پوجنا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

اس قول میں اس مضمون کی طرف بھی اشارہ ہے جو سورہ مریم میں ارشاد ہوا کہ وَ اتَّخِذُوا مِنْ دُونَ اللَّهِ

اِلَهَةً لَيْكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ﴿٢٦﴾ كَلَّا ۖ سَيَكُفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضَدًا ﴿٢٧﴾۔ (آیت

81-82) انہوں نے اللہ کے سواد و سرے معبود بنالیے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے ذریعہ قوت ہوں۔ ہرگز نہیں۔ عنقریب وہ وقت آئے گا جبکہ وہ ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور اللہ ان کے مخالف ہوں گے۔ یعنی قیامت کے روز وہ ان کے خلاف گواہی دیں گے اور صاف کہہ دیں گے کہ نہ ہم نے ان سے کبھی کہا کہ ہماری عبادت کرو، نہ ہمیں خبر کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔

یہاں حکمت تبلیغ کا بھی ایک نکتہ قابل توجہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ تمہارے دشمن ہیں، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ وہ میرے دشمن ہیں۔ اگر وہ کہتے کہ یہ تمہارے دشمن ہیں تو مخاطب کے لیے ضد میں مبتلا ہو جانے کا زیادہ موقع تھا۔ وہ اس بحث میں پڑ جاتا کہ بتاؤ، وہ ہمارے دشمن کیسے ہو گئے۔ بخلاف اس کے جب انہوں نے کہا کہ وہ میرے دشمن ہیں تو اس سے مخاطب کے لیے یہ سوچنے کا موقع پیدا ہو گیا کہ وہ بھی اسی طرح اپنے بھلے اور برے کی فکر کرے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے کی ہے۔ اس طریقہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے گویا ہر انسان کے اس فطری جذبے سے اپیل کی جس کی بناء پر وہ خود اپنا خیر خواہ ہوتا ہے اور جان بوجھ کر کبھی اپنا برا نہیں چاہتا۔ انہوں نے اسے بتایا کہ میں تو ان کی عبادت میں سراسر نقصان دیکھتا ہوں، اور دیدہ و دانستہ میں اپنی بد خواہی نہیں کر سکتا، لہذا دیکھ لو کہ میں خود ان کی بندگی و پرستش سے قطعی اجتناب کرتا ہوں۔ اس کے بعد مخاطب فطرۃ یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اس کی اپنی بھلانی کس چیز میں ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ نادانستہ اپنی بد خواہی کر رہا ہو۔

▲ سورۃ الشعرااء حاشیہ نمبر: 56

یعنی تمام ان معبودوں میں سے، جن کی دنیا میں بندگی و پرستش کی جاتی ہے، صرف ایک اللہ رب العالمین ہے جس کی بندگی میں مجھے اپنی بھلائی نظر آتی ہے، اور جس کی عبادت میرے نزدیک ایک دشمن کی نہیں بلکہ اپنے اصل مربی کی عبادت ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام چند فقرتوں میں وہ وجہ بیان کرتے ہیں جن کی بناء پر صرف اللہ رب العالمین ہی عبادت کا مستحق ہے، اور اس طرح اپنے مخاطبوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمہارے پاس تو معبود ان غیر اللہ کی عبادت کے لیے کوئی معقول وجہ بجز تقلید آبائی کے نہیں ہے جسے تم بیان کر سکو، مگر میرے پاس صرف ایک اللہ کی عبادت کرنے کے لیے نہایت معقول وجہ موجود ہیں جن سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔

▲ سورۃ الشعرااء حاشیہ نمبر: 57

یہ اولین وجہ ہے جس کی بناء پر اللہ اور صرف ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔ مخاطب بھی اس حقیقت کو جانتے اور مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے، اور انہیں یہ بھی تسلیم تھا کہ ان کے پیدا کرنے میں کسی دوسرے کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اپنے معبودوں کے بارے میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم سمیت تمام مشرکین کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کے مخلوق ہیں۔ بجز دہریوں کے اور کسی کو بھی دنیا میں اللہ کے خلق کائنات ہونے سے انکار نہیں رہا۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دلیل یہ تھی کہ میں صرف اس کی عبادت کو صحیح و برحق سمجھتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ دوسری کوئی ہستی میری عبادت کی کیسے مستحق ہو سکتی ہے جبکہ میرے پیدا کرنے میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ مخلوق کو اپنے خالق کی بندگی تو کرنی ہی چاہیے، لیکن غیر خالق کی بندگی وہ کیوں کرے؟

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 58 ▲

یہ دوسری وجہ ہے اللہ اور اکیلے اللہ ہی کے مستحق عبادت ہونے کی۔ اگر اس نے انسان کو بس پیدا ہی کر کے چھوڑ دیا ہوتا اور آگے اس کی خبر گیری سے وہ بالکل بے تعلق رہتا، تب بھی کوئی معقول وجہ اس امر کی ہو سکتی تھی کہ انسان اس کے علاوہ کسی دوسری طرف بھی سہارے ڈھونڈنے کے لیے رجوع کرتا۔ لیکن اس نے تو پیدا کرنے کے ساتھ رہنمائی، پروش، نگہداشت، حفاظت اور حاجت روائی کا ذمہ بھی خود ہی لے لیا ہے۔ جس لمحے انسان دنیا میں قدم رکھتا ہے اسی وقت ایک طرف اس کی ماں کے سینے میں دودھ پیدا ہو جاتا ہے تو دوسری طرف کوئی ان دیکھی طاقت اسے دودھ چو سنے اور حلق سے اتارنے کا طریقہ سکھا دیتی ہے۔ پھر اس تربیت و رہنمائی کا سلسلہ اول روز پیدائش سے شروع ہو کر موت کی آخری ساعت تک برابر جاری رہتا ہے۔ زندگی کے ہر مرحلے میں انسان کو اپنے وجود اور نشوونما اور بقاء و ارتقاء کے لیے جس جس نوعیت کے سروسامان کی حاجت پیش آتی ہے وہ سب اس کے پیدا کرنے والے نے زمین سے لے کر آسمان تک ہر طرف مہیا کر دیا ہے۔ اس سروسامان سے فائدہ اٹھانے اور کام لینے کے لیے جن طاقتوں اور قابلیتوں کی اس کو حاجت پیش آتی ہے وہ سب بھی اس کی ذات میں ودیعت کر دی ہیں۔ اور ہر شعبہ حیات میں جس جس طرح کی رہنمائی اس کو درکار ہوتی ہے اس کا بھی پورا انتظام اس نے کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے انسانی وجود کی حفاظت کے لیے اور اس کو آفات سے، بیماریوں سے، مہلک جراثیم سے اور زہر لیے اثرات سے بچانے کے لیے خود اس کے جسم میں اتنے زبردست انتظامات کیے ہیں کہ انسان کا علم ابھی تک ان کا پورا احاطہ بھی نہیں کر سکا ہے۔ اگر یہ قدرتی انتظامات موجود نہ ہوتے تو ایک معمولی کائنات جو جانا بھی انسان کے لیے مہلک ثابت ہوتا اور اپنے علاج کے لیے آدمی کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکتی۔ خالق کی یہ ہمہ گیر رحمت و ربویت جب ہر آن ہر پہلو سے انسان کی دست گیری کر رہی ہے تو اس سے بڑی حماقت و جہالت اور کیا ہو سکتی ہے، اور اس سے بڑھ کر احسان

فراموشی بھی اور کونسی ہو سکتی ہے کہ انسان اس کو چھوڑ کر کسی دوسری ہستی کے آگے سر نیاز جھکائے اور حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے کسی اور کادا من تھا۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 59 ▲

یہ تیسرا وجہ ہے جس کی بنابر اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت درست نہیں ہو سکتی۔ انسان کا معاملہ اپنے خدا کے ساتھ صرف اس دنیا اور اس کی زندگی تک محدود نہیں ہے کہ وجود کی سرحد میں قدم رکھنے سے شروع ہو کر موت کی آخری پھیل پروہ ختم ہو جائے، بلکہ اس کے بعد اس کا انجام بھی سراسر خدا ہی کے ہاتھ میں ہے، وہی خدا جو اس کو وجود میں لا یا ہے، آخر کار اسے اس دنیا سے واپس بلا لیتا ہے اور کوئی طاقت دنیا میں ایسی نہیں ہے جو انسان کی اس واپسی کو روک سکے۔ آج تک کسیدوا یا طبیب یا دیوی دیوتا کی مداخلت اس ہاتھ کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے جو انسان کو یہاں سے نکال لے جاتا ہے، حتیٰ کہ وہ بہت سے انسان بھی جنہیں معبد بنائ کر انسانوں نے پونج ڈالا ہے، خود اپنی موت کو نہیں ٹال سکے ہیں۔ صرف خدا ہی اس امر کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس شخص کو کب اس جہان سے واپس طلب کرنا ہے، اور جس وقت جس کی طلبی بھی اس کے ہاں سے آجائی ہے اسے چاروں ناچار جانا ہی پڑتا ہے۔ پھر وہی خدا ہے جو اکیلا اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ کب ان تمام انسانوں کو جو دنیا میں پیدا ہوئے تھے دوبارہ وجود میں لائے اور ان سے ان کی حیات دنیا کا محاسبہ کرے۔ اس وقت بھی کسی کی یہ طاقت نہ ہو گی کہ بعث بعد الموت سے کسی کو بچا سکے یا خود بچ سکے۔ ہر ایک کو اس کے حکم پر اٹھنا ہی ہو گا اور اس کی عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ پھر وہی اکیلا خدا اس عدالت کا قاضی و حاکم ہو گا۔ کوئی دوسری اس کے اختیارات میں ذرہ برابر بھی شریک نہ ہو گا۔ سزا دینا یا معاف کرنا بالکل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہو گا۔ کسی کی یہ طاقت نہ ہو گی کہ جسے وہ سزا دینا چاہے اس کو بخشوائے جائے، یا جسے وہ بخشن چاہے اس سزا دلوں سکے۔ دنیا میں جن کو بخشوائیں کا مختار سمجھا جاتا ہے وہ خود اپنی بخشش کے لیے بھی اسی کے فضل و کرم کی آس

لگائے بیٹھے ہوں گے۔ ان حقائق کی موجودگی میں جو شخص خدا کے سوا کسی کی بندگی کرتا ہے وہ اپنی بدانجامی کا خود سامان کرتا ہے۔ دنیا سے لے کر آخرت تک آدمی کی ساری قسمت تو ہو خدا کے اختیار میں، اور اسی قسمت کے بناؤ کی خاطر آدمی رجوع کرے ان کی طرف جن کے اختیار میں کچھ نہیں ہے! اس سے بڑھ کر شامت اعمال اور کیا ہو سکتی ہے۔

▲ سورۃ الشعرااء حاشیہ نمبر: 60

"حکم" سے مراد "نبوت" یہاں درست نہیں ہے، کیونکہ جس وقت کی یہ دعا ہے اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت عطا ہو چکی تھی۔ اور اگر بالفرض یہ دعا اس سے پہلے کی بھی ہو تو نبوت کسی کی طلب پر اسے عطا نہیں کی جاتی بلکہ وہ ایک وہی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ خود ہی جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ اس لیے یہاں حکم سے مراد علم، حکمت، فہم صحیح اور قوت فیصلہ ہی لینا درست ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قریب قریب اسی معنی میں ہے جس میں نبی ﷺ سے یہ دعا منقول ہے کہ **أَرْفَا إِلَّا شَيْءَ كَمَا هِيَ** یعنی ہم کو اس قابل بناؤ کہ ہم ہر چیز کو اسی نظر سے دیکھیں جیسی کہ وہ فی الواقع ہے اور ہر معاملہ میں وہی رائے قائم کریں جیسی کہ اس کی حقیقت کے لحاظ سے قائم کی جانی چاہیے۔

▲ سورۃ الشعرااء حاشیہ نمبر: 61

یعنی دنیا میں مجھے صالح سوسائٹی دے اور آخرت میں میراحشر صالحوں کے ساتھ کر۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے، صالح لوگوں کے ساتھ کسی کا حشر ہونا اور اس کا نجات پانا گویا ہم معنی ہیں، اس لیے یہ توہر اس انسان کی دعا ہونی ہی چاہیے جو حیات بعد الموت اور جزا اپر یقین رکھتا ہو۔ لیکن دنیا میں بھی ایک پاکیزہ روح کی دلی تمنا یہی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایک بد اخلاق فاسق و فاجر معاشرے میں زندگی بسر کرنے کی مصیبت سے نجات دے اور اس کو نیک لوگوں کے ساتھ ملانے۔ معاشرے کا بگاڑ جہاں چاروں طرف محیط ہو وہاں ایک آدمی کے لیے صرف یہی چیز ہے وقت اذیت کی موجب نہیں ہوتی کہ وہ اپنے گرد و پیش گندگی ہی گندگی پھیلی ہوئی دیکھتا

ہے، بلکہ اس کے لیے خود پاکیزہ رہنا اور اپنے آپ کو گندگی کی چھینٹوں سے بچا کر رکھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے ایک صالح آدمی اس وقت تک بے چین ہی رہتا ہے جب تک یا تو اس کا اپنا معاشرہ پاکیزہ نہ ہو جائے، یا پھر اس سے نکل کر وہ کوئی دوسری ایسی سوسائیٹی نہ پالے جو حق و صداقت کے اصولوں پر چلنے والی ہو۔

▲ سورۃ الشعرااء حاشیہ نمبر: 62

یعنی بعد کی نسلیں مجھے خیر کے ساتھ یاد کریں۔ میں دنیا سے وہ کام کر کے نہ جاؤں کہ نسل انسانی میرے بعد میرا شمار ان ظالموں میں کرے جو خود بگڑے ہوئے تھے اور دنیا کو بگاڑ کر چلے گئے، بلکہ مجھ سے وہ کارنا مے انجام پائیں جن کی بدولت رہتی دنیا تک میری زندگی خلق خدا کے لیے روشنی کا مینار بنی رہے اور مجھے انسانیت کے محسنوں میں شمار کیا جائے۔ یہ محض شہرت و ناموری کی دعا نہیں ہے بلکہ سچی شہرت اور حقیقی ناموری کی دعا ہے جو لازماً ٹھوس خدمات اور بیش قیمت کارناموں ہی کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اس چیز کا حاصل ہونا اپنے اندر دوفائدے رکھتا ہے۔ دنیا میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسانی نسلوں کو بری مثالوں کے مقابلے میں ایک نیک مثال ملتی ہے جس سے وہ بھلائی کا سبق حاصل کرتی ہیں اور ہر سعید روح کو راہ راست پر چلنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ اور آخرت میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک آدمی کی چھوڑی ہوئی نیک مثال سے قیامت تک جتنے لوگوں کو بھی ہدایت نصیب ہوئی ہو ان کا ثواب اس شخص کو بھی ملے گا اور قیامت کے روز اس کے اپنے اعمال کے ساتھ کروڑوں بندگان خدا کی یہ گواہی بھی اس کے حق میں موجود ہو گی کہ وہ دنیا میں بھلائی کے چشمے روں کر کے آیا ہے جن سے نسل پر نسل سیراب ہوتی رہی ہے۔

▲ سورۃ الشعرااء حاشیہ نمبر: 63

بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعائے مغفرت کی یہ توجیہ بیان کی ہے کہ مغفرت بہر حال اسلام کے ساتھ مشروط ہے اس لیے آنحضرت کا اپنے والد کی مغفرت کے لیے دعا کرنा گویا اس بات کی دعا کرنا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ لیکن قرآن مجید میں اس کے متعلق مختلف مقامات پر جو

تصریحات ملتی ہیں وہ اس توجیہ سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کے ظلم سے تنگ آ کر جب گھر سے نکلنے لگے تو انہوں نے رخصت ہوتے وقت فرمایا **سَلْمُ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّ إِنَّهُ كَانَ بِيْ حَفِيّْا** (مریم، آیت 47) "آپ کو سلام ہے، میں آپ کے لیے اپنے رب سے بخشش کی دعا کروں گا، وہ میرے اوپر نہایت مہربان ہے"۔ اسی وعدے کی بنا پر انہوں نے یہ دعائے مغفرت نہ صرف اپنے باپ کے لیے کی بلکہ ایک دوسرے مقام پر بیان ہوا ہے کہ ماں اور باپ دونوں کے لیے کی **رَبَّنَا أَغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْ** (ابراہیم۔ آیت 41)۔ لیکن بعد میں انہیں خود یہ احساس ہو گیا کہ ایک دشمن حق، چاہے وہ ایک مومن کا باپ ہی کیوں نہ ہو، دعائے مغفرت کا مستحق نہیں ہے۔ **وَمَا كَانَ أَسْتِغْفَارُ أَبْرَاهِيمَ لَأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوُّ بِلَهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ** (التوبہ۔ آیت 114) "ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کرنا محض اس وعدے کی وجہ سے تھا جو اس نے اس سے کیا تھا۔ مگر جب یہ بات اس پر کھل گئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس نے اس سے اظہار بیزاری کر دیا"۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 64 ▲

یعنی قیامت کے روز یہ رسول اللہ مجھے نہ دکھا کہ میدانِ حشر میں تمام اولین و آخرین کے سامنے ابراہیم علیہ السلام کا باپ سزا پا رہا ہو اور ابراہیم علیہ السلام کھڑا دیکھ رہا ہو۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 65 ▲

ان دونوں کے متعلق یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا حصہ ہیں یا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے قول پر اضافہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ اگر پہلی بات مانی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کے لیے یہ دعا کرتے وقت خود بھی ان حقائق کا احساس

رکھتے تھے۔ اور دوسری بات تسلیم کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ان کی دعا پر تبرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یہ فرمارہا ہے کہ قیامت کے دن آدمی کے کام اگر کوئی چیز آسکتی ہے تو وہ مال اور اولاد نہیں بلکہ صرف قلب سلیم ہے، ایسا دل جو کفر و شرک و نافرمانی اور فسق و فجور سے پاک ہو۔ مال اور اولاد بھی قلب سلیم ہی کے ساتھ نافع ہو سکتے ہیں، اس کے بغیر نہیں۔ مال صرف اس صورت میں وہاں مفید ہو گا جبکہ آدمی نے دنیا میں ایمان و اخلاص کے ساتھ اسے اللہ کی راہ میں صرف کیا ہو، ورنہ کروڑ پتی اور ارب پتی آدمی بھی وہاں کنگال ہو گا۔ اولاد بھی صرف اسی حالت میں وہاں کام آسکے گی جبکہ آدمی نے دنیا میں اسے اپنی حد تک ایمان اور حسن عمل کی تعلیم دی ہو، ورنہ بیٹھا اگر نبی بھی ہو تو وہ باپ سزا اپانے سے نہیں بچ سکتا جس کا اپنا خاتمہ کفر و معصیت پر ہوا ہو اور اولاد کی نیکی میں جس کا اپنا کوئی حصہ نہ ہو۔

سورة الشuraء حاشیہ نمبر: 66 ▲

یہاں سے آخر پیرا گراف تک کی پوری عبارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام کا جز نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس کا مضمون صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے۔

سورة الشuraء حاشیہ نمبر: 67 ▲

یعنی ایک طرف متین لوگ جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی یہ دیکھ رہے ہوں گے کہ کیسی نعمتوں سے لبریز جگہ ہے جہاں اللہ کے فضل سے ہم جانے والے ہیں۔ اور دوسری طرف گراہ لوگ ابھی میدان حشر ہی میں ہوں گے کہ ان کے سامنے اس جہنم کا ہولناک منظر پیش کر دیا جائے گا جس میں انہیں جانا ہے۔

سورة الشuraء حاشیہ نمبر: 68 ▲

اصل میں لفظ **كُبِّيْبُوْا** فرمایا گیا ہے جس میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ ایک کے اوپر ایک دھکیل دیا جائے گا، دوسرے یہ کہ وہ قعر جہنم تک لڑھکتے چلے جائیں گے۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 69 ▲

یہ پیروؤں اور معتقدوں کی طرف سے ان لوگوں کی تواضع ہو رہی ہو گی جنہیں یہی لوگ دنیا میں بزرگ، پیشوں اور رہنماء نتے رہے تھے، جن کے ہاتھ پاؤں چومنے جاتے تھے، جن کے قول و عمل کو سند مانا جاتا تھا، جن کے حضور نذریں گزرا نی جاتی تھیں۔ آخرت میں جا کر جب حقیقت کھلے گی اور پیچھے چلنے والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ آگے چلنے والے خود کہاں آئے ہیں اور ہمیں کہاں لے آئے ہیں تو یہی معتقدین ان کو مجرم ٹھہرائیں گے اور ان پر لعنت بھیجیں گے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ عالم آخرت کا یہ عبرت ناک نقشہ کھینچا گیا ہے تاکہ اندھی تقليد کرنے والے دنیا میں آنکھیں کھولیں اور کسی کے پیچھے چلنے سے پہلے دیکھ لیں کہ وہ ٹھیک بھی جا رہا ہے یا نہیں۔ سورہ اعراف میں:

كُلَّمَا دَخَلْتُ أُمَّةً لَعَنَتْ أُخْتَهَا طَحْتَى إِذَا أَدَارَ كُوْفَةً فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرِبُهُمْ لَا وَلَهُمْ

رَبَّنَا هُوَ لَأِنَّا أَصْلُونَا فَأَتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِنَ النَّارِ قَالَ يُكَلِّ ضِعْفٌ وَنُكِنْ لَا تَعْلَمُونَ

(آیت 38) 

ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہو گا تو اپنے ساتھ کے گروہ پر لعنت کرتا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے متعلق کہے گا کہ اے ہمارے رب، یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، اب انہیں آگ کا دوہرہ اعدام دے۔ رب فرمائے گا سب ہی کے لیے دوہرہ اعدام ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔ سورہ الحم السجدہ میں ارشاد ہوا ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا أَرِنَا الَّذِينَ أَصْلَنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ نَجْعَلُهُمْ نَحْتَ أَقْدَامِنَا

لَيَكُونَنَا مِنَ الْأَسْفَلِينَ  (آیت 29).

اور کافر اس وقت کہیں گے کہ اے پروردگار، ان جنوں اور انسانوں کو ہمارے سامنے لا جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا تاکہ ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں اور وہ پست و ذلیل ہو کر رہیں۔ پہی مضمون سورہ احزاب میں ارشاد ہوا ہے

وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا آتَيْنَا سَادَةَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ﴿٢﴾ رَبَّنَا أَتِهِمْ ضِعَفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنَاهُ كَبِيرًا ﴿٣﴾ (آیات 67-68)

اور وہ کہیں گے اے رب، ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہم کو سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔ اے رب، ان کو دو گناہ عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 70 ▲

یعنی جنہیں ہم دنیا میں سفارشی سمجھتے تھے اور جن کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ تھا کہ ان کا دامن جس نے تھام لیا بس اس کا بیڑا اپار ہے، ان میں سے آج کوئی بھی سعی سفارش کے لیے زبان کھولنے والا نہیں ہے۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 71 ▲

یعنی کوئی ایسا بھی نہیں ہے جو ہمارا غم خوار اور ہمارے لیے کڑھنے والا ہو، چاہے ہم کو چھڑانہ سکے مگر کم از کم اسے ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی ہی ہو۔ قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ آخرت میں دوستیاں صرف اہل ایمان ہی کی باقی رہ جائیں گی۔ رہے مگر اہلوگ، تو وہ دنیا میں چاہے کیسے ہی جگری دوست رہے ہوں، وہاں پہنچ کر ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوں گے، ایک دوسرے کو مجرم ٹھہرائیں گے اور اپنی بر بادی کا ذمہ دار قرار دے کر ہر ایک دوسرے کو زیادہ سزاد لوانے کی کوشش کرے گا۔ **أَلَا خِلَّاءُ يَوْمَيْذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌ إِلَّا الْمُتَّقِينَ** ﴿٦﴾ (الزخرف۔ آیت 67) "دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متین (کی دوستیاں قائم رہیں گی)"۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 72 ▲

اس تمنا کا جواب بھی قرآن میں دے دیا گیا ہے کہ **وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نَهُوا عَنْهُ**۔ (الانعام۔ آیت 28) "اگر انہیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیج دیا جائے تو وہی کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے"۔ رہایہ سوال کہ انہیں واپسی کا موقع کیوں نہ دیا جائے گا، اس کے وجہ پر مفصل بحث ہم سورہ مومنون حواشی 90 تا 92 میں کر چکے ہیں۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 73 ▲

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قصے میں نشانی کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ مشرکین عرب اور بالخصوص قریش کے لوگ ایک طرف تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کا دعویٰ اور ان کے ساتھ انتساب پر فخر کرتے ہیں مگر دوسری طرف اسی شرک میں مبتلا ہیں جس کے خلاف جدوجہد کرتے ان کی عمر بیت گئی تھی، اور ان کے لائے ہوئے دین کی دعوت آج جو نبی پیش کر رہا ہے اس کے خلاف ٹھیک وہی کچھ کر رہے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو شرک کے دشمن اور دعوت توحید کے علم بردار تھے، تم خود بھی جانتے اور مانتے ہو کہ حضرت مددوح مشرک نہ تھے، مگر پھر بھی تم اپنی ضد پر قائم ہو۔ دوسرا پہلو اس قصہ میں نشانی کا یہ ہے کہ قوم ابراہیم علیہ السلام دنیا سے مٹ گئی اور ایسی مٹی کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا، اس میں سے اگر کسی کو بقا نصیب ہو تو صرف ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مبارک فرزندوں (اسما عیل علیہ السلام و اسحاق علیہ السلام) کی اولاد ہی کو نصیب ہوا۔ قرآن میں اگرچہ اس عذاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نکل جانے کے بعد ان کی قوم پر آیا، لیکن اس کا شمار معدب قوموں ہی میں کیا گیا ہے، **أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأً الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمٌ نُّوحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثُمُودٍ وَّ قَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَ أَصْحَابِ مَدْيَنَ وَ الْمُؤْتَفَكِتُ** (التوبہ۔ آیت 70)۔

كَذَّبُتْ قَوْمٌ نُوحٌ الْمُرْسِلِينَ ﴿١٠٥﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخْوْهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٠٦﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ
 أَمِينٌ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٠٨﴾ وَمَا آتَيْنَاكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرٍ إِلَّا عَلَى رَبِّ
 الْعَالَمِينَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١١٠﴾ قَالُوا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ ط ﴿١١١﴾ قَالَ وَمَا
 عَلِيٌّ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٢﴾ إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَى رَبِّهِمْ لَوْ تَشْعُرُونَ ﴿١١٣﴾ وَمَا أَنَا بِطَارِدٍ
 الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٤﴾ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ط ﴿١١٥﴾ قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَنْوِحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ
 الْمُرْجُومِينَ ط ﴿١١٦﴾ قَالَ رَبِّي إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ﴿١١٧﴾ فَأَفْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتُحَاجَأَ وَنَجِنِي وَمَنْ مَعَيَ
 مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٨﴾ فَأَنْجِيَنَّهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلُكِ الْمَسْحُونِ ﴿١١٩﴾ ثُمَّ أَغْرَقْنَا بَعْدُ
 الْبَقِينَ ط ﴿١٢٠﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَاءَةً ط وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿١٢١﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُمَا الْعَزِيزُ

74 قوم نوح نے رسولوں کو جھٹلایا۔ **75** یاد کرو جبکہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا تھا ”کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ **76** میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں **77**، لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ **78** میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تورب العالمین کے ذمہ ہے۔ **79** پس تم اللہ سے ڈرو اور **۸۰** بے کھلکھلے میری اطاعت کرو۔ **۸۱** ”انہوں نے جواب دیا ”کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے؟ **۸۲** ”نوح نے کہا ”میں کیا جانوں کہ ان کے عمل کیسے ہیں، ان کا حساب تو میرے رب کے ذمہ ہے، کاش تم کچھ شعور سے کام لو۔ **۸۳** میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو ایمان لا سیں ان کو میں دھتکار دوں۔ میں تو بس ایک صاف صاف متنبہ کر دینے والا آدمی ہوں۔ **۸۴** ”انہوں نے کہا ”اے نوح، اگر تو باز نہ آیا تو پھٹکارے ہوئے لوگوں میں شامل ہو کر رہے گا۔ **۸۵** ”نوح نے دعا کی ”اے میرے رب، میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا۔ **۸۶** اب میرے اور ان کے درمیان دو ٹوک فیصلہ کر دے اور مجھے اور جو مومن میرے ساتھ ہیں ان کو نجات دے۔ **۸۷** ”آخر کار ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ایک بھری ہوئی کشتی میں بچا لیا۔ اور اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا۔

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبر دست بھی ہے اور رحم جنم بھی۔ ۶۶

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 74 ▲

تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات 59 تا 64۔ یونس، آیات 71 تا 73۔ ہود، آیات 25 تا 48۔ بنی اسرائیل، آیت 3۔ الانبیاء، آیات 76 تا 77۔ المؤمنون، آیات 23 تا 30۔ الفرقان، آیت 37۔ اس کے علاوہ قصہ نوح علیہ السلام کی تفصیلات کے لیے قرآن مجید کے حسب ذیل مقامات بھی پیش نظر رہیں: العنكبوت آیات 14-15۔ الصَّفَتُ، آیات 75 تا 82۔ القمر، آیات 9-15۔ سورہ نوح مکمل۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 75 ▲

اگرچہ انہوں نے ایک ہی رسول کو جھپٹایا تھا، لیکن چونکہ رسول کی تکذیب در حقیقت اس دعوت اور پیغام کی تکذیب ہے جسے لے کر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے، اس لیے جو شخص یا گروہ کسی ایک رسول کا بھی انکار کر دے وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تمام رسولوں کا منکر ہے۔ یہ ایک بڑی اہم اصولی حقیقت ہے جسے قرآن میں جگہ جگہ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی کافر ٹھہرائے گئے ہیں جو صرف ایک نبی کا انکار کرتے ہوں، باقی تمام انبیاء کو مانتے ہوں۔ اس لیے کہ جو شخص اصل پیغام رسالت کا ماننے والا ہے وہ تو لازماً ہر رسول کو مانے گا۔ مگر جو شخص کسی رسول کا انکار کرتا ہے وہ اگر دوسرے رسولوں کو مانتا بھی ہے تو کسی عصیت یا تقلید آبائی کی بنا پر مانتا ہے، نفس پیغام رسالت کو نہیں مانتا، ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہی حق ایک پیش کرے تو یہ اسے مان لے اور وہی دوسرے پیش کرے تو یہ اس کا انکار کر دے۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 76 ▲

دوسرے مقامات پر حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم سے ابتدائی خطاب ان الفاظ میں آیا ہے **أَعْبُدُوا إِلَهًا**
مَا أَنْكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ أَفَلَا تَتَّقُونَ (المؤمنون آیت 23) "اللہ کی بندگی کرو، اس کے سواتھ مہارا کوئی خدا نہیں ہے، تو کیا تم ڈرتے نہیں ہو"؟ **أَعْبُدُوا إِلَهًا وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ** (نوح آیت 3)۔ "اللہ کی بندگی

کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ "اس لیے یہاں حضرت نوح علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب محض خوف نہیں بلکہ اللہ کا خوف ہے۔ یعنی کیا تم اللہ سے بے خوف ہو گئے؟ اس کے سوا دوسروں کی بندگی کرتے ہوئے تم کچھ نہیں سوچتے کہ اس با غایانہ روشن کا انعام کیا ہو گا؟

دعوت کے آغاز میں خوف دلانے کی حکمت یہ ہے کہ جب تک کسی شخص یا گروہ کو اس کے غلط رویے کی بد انجمائی کا خطرہ نہ محسوس کرایا جائے، وہ صحیح بات اور اس کے دلائل کی طرف توجہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ راہ راست کی تلاش آدمی کے دل میں پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب اس کو یہ فکر دا من گیر ہو جاتی ہے کہ کہیں میں کسی ٹیڑھے راستے پر تو نہیں جا رہا ہوں جس میں ہلاکت کا اندیشه ہو۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 77

اس کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ میں اپنی طرف سے کوئی بات بنانا کریا کم و بیش کر کے بیان نہیں کرتا بلکہ جو کچھ خدا کی طرف سے مجھ پر نازل ہوتا ہے وہی بے کم و کاست تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ میں ایک ایسا رسول ہوں جسے تم پہلے سے ایک امین اور راستباز آدمی کی حیثیت سے جانتے ہو۔ جب میں خلق کے معاملے میں خیانت کرنے والا نہیں ہوں تو خدا کے معاملے میں کیسے خیانت کر سکتا ہوں۔ لہذا تمہیں باور کرنا چاہیے کہ جو کچھ میں خدا کی طرف سے پیش کر رہا ہوں اس میں بھی ویسا ہی امین ہوں جیسا دنیا کے معاملات میں آج تک تم نے مجھے امین پایا ہے۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 78

یعنی میرے رسول امین ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم دوسرے سب مطاوعوں کی اطاعت چھوڑ کر صرف میری اطاعت کرو اور جو احکام میں تمہیں دیتا ہوں ان کے آگے سر تسلیم خم کر دو، کیونکہ میں خداوند عالم کی مرضی کا نما سندہ ہوں، میری اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور میری نافرمانی محض میری ذات کی نافرمانی نہیں بلکہ براہ راست خدا کی نافرمانی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کا حق صرف اتنا ہی نہیں ہے

کہ جن لوگوں کی طرف وہ رسول بنائے کر بھیجا گیا ہے وہ اس کی صداقت تسلیم کر لیں اور اسے رسول برحق مان لیں۔ بلکہ اس کو خدا کا سچا رسول مانتے ہی آپ سے آپ یہ بھی لازم آ جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور ہر دوسرے قانون کو چھوڑ کر صرف اسی کے لائے ہوئے قانون کا اتباع کیا جائے۔ رسول کو رسول نہ مانتا، یا رسول مان کر اس کی اطاعت نہ کرنا، دونوں صورتیں دراصل خدا سے بغاوت کی ہم معنی ہیں اور دونوں کا نتیجہ خدا کے غصب میں گرفتار ہونا ہے۔ اسی لیے ایمان اور اطاعت کے مطالبے سے پہلے "اللہ سے ڈرو" کا تنبیہی فقرہ ارشاد فرمایا گیا تاکہ ہر مخاطب اچھی طرح کانکھوں کر سن لے کہ رسول کی رسالت تسلیم نہ کرنے یا اس کی اطاعت قبول نہ کرنے کا نتیجہ کیا ہو گا۔

▲ سورۃ الشعرااء حاشیہ نمبر: 79

یہ اپنی صداقت پر حضرت نوحؐ کی دوسری دلیل ہے۔ پہلی دلیل یہ تھی کہ دعوائے نبوت سے پہلے میری ساری زندگی تمہارے درمیان گزری ہے اور آج تک تم مجھے ایک امین آدمی کی حیثیت سے چانتے رہے ہو۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ میں ایک بے غرض آدمی ہوں، تم کسی ایسے ذاتی فائدے کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو اس کام سے مجھے حاصل ہو رہا ہو یا جس کے حصول کی میں کوشش کر رہا ہوں۔ اس بے غرضانہ طریقہ سے کسی ذاتی نفع کے بغیر جب میں اس دعوت حق کے کام میں شب و روز اپنی جان کھپار رہا ہوں، اپنے اوقات اور اپنی محنتیں صرف کر رہا ہوں اور ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا رہا ہوں، تو تمہیں باور کرنا چاہیے کہ میں اس کام میں مخلص ہوں، ایمانداری کے ساتھ جس چیز کو حق جانتا ہوں اور جس کی پیروی میں خلق خدا کی فلاح دیکھتا ہوں وہی پیش کر رہا ہوں، کوئی نفسانی جذبہ اس کا محرك نہیں ہے کہ اس کی خاطر میں جھوٹ گھٹ کر لوگوں کو دھوکا دوں

یہ دونوں دلیلیں ان اہم دلائل میں سے ہیں جو قرآن مجید نے بار بار انبیاء علیہم السلام کی صداقت کے ثبوت میں پیش کی ہیں اور جن کو وہ نبوت کے پرکھنے کی کسوٹی قرار دیتا ہے۔ نبوت سے پہلے جو شخص ایک معاشرے میں برسوں زندگی بسر کر چکا ہو اور لوگوں نے ہمیشہ ہر معاملہ میں اسے سچا اور راستباز آدمی پایا ہو، اس کے متعلق کوئی غیر متعصب آدمی مشکل ہی سے یہ شک کر سکتا ہے کہ وہ یکا یک خدا کے نام سے اتنا بڑا جھوٹ بولنے پر اتر آئے گا کہ اسے نبی نہ بنایا گیا ہوا اور وہ کہے کہ خدا نے مجھے نبی بنایا ہے۔ پھر دوسرا اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ ایسا سفید جھوٹ کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ تو نہیں گھٹرا کرتا۔ لا محالہ کوئی نفسانی غرض ہی اس فریب کاری کی محرک ہوتی ہے۔ اور جب کوئی شخص اپنی اغراض کے لیے اس طرح کی فریب کاری کرتا ہے تو اخفاکی تمام کوششوں کے باوجود اس کے آثار نمایاں ہو کر رہتے ہیں۔ اسے اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑتے ہیں جن کے گھناوے نے پہلو گرد و پیش کے معاشرے میں چھپائے نہیں چھپ سکتے۔ اور مزید برآں وہ اپنی پیری کی دکان چمکا کر کچھ نہ کچھ اپنا بھلا کرتا نظر آتا ہے۔ نذرانے وصول کیے جاتے ہیں، لنگر جاری ہوتے ہیں، جائیدادیں بنتی ہیں، زیور گھٹے جاتے ہیں، اور فقیری کا آستانہ دیکھتے دیکھتے شاہی دربار بتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جہاں اس کے بر عکس نبوت کا دعویٰ کرنے والے شخص کی ذاتی زندگی ایسے فضائل اخلاق سے لبریز نظر آئے کہ اس میں کہیں ڈھونڈے سے بھی کسی فریب کارانہ ہتھکنڈے کا نشان نہ مل سکے، اور اس کام سے کوئی ذاتی فائدہ اٹھانا تو درکنار، وہ اپناسب کچھ اسی خدمت بے مزد کی نذر کر دے، وہاں جھوٹ کا شہبہ کرنا کسی معقول انسان کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ کوئی شخص جو عقل بھی رکھتا ہو اور بے انصاف بھی نہ ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ آخر ایک اچھا بھلا آدمی، جو اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا، کیوں بلا وجہ ایک جھوٹا دعویٰ لے کر اٹھے جبکہ اسے کوئی فائدہ اس جھوٹ سے نہ ہو، بلکہ وہ الٹا اپنامال، اپنا وقت اور اپنی ساری قوتیں اور محنتیں اس کام میں کھپا رہا ہو اور بد لے میں دنیا بھر کی دشمنی مول لے رہا ہو۔ ذاتی مفاد کی قربانی

آدمی کے مخلص ہونے کی سب سے زیادہ نمایاں دلیل ہوتی ہے۔ یہ قربانی کرتے جس کو سالوں بیت جائیں اسے بد نیت یا خود غرض سمجھنا خود اس شخص کی اپنی بد نیت کا ثبوت ہوتا ہے جو ایسے آدمی پر یہ الزام لگائے۔ (مزید تشریع کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ 70)۔

▲ سورۃ الشعرااء حاشیہ نمبر: 80

اس فقرے کی تکرار بے وجہ نہیں ہے۔ پہلے یہ ایک اور مناسبت سے فرمایا گیا تھا اور یہاں ایک دوسری مناسبت سے اس کو دھرا یا گیا ہے۔ اوپر این **نَكْمٌ رَسُولٌ أَمِينٌ سَفَاتَقُوا اللَّهَ** کے فقرے کی مناسبت یہ تھی کہ جو شخص اللہ کی طرف سے ایک امانت دار رسول ہے، جس کی صفت امانت سے تم لوگ خود بھی واقف ہو، اسے جھٹلاتے ہوئے خدا سے ڈرو۔ اور یہاں **مَا أَسْعَلْ كُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ** سے اس فقرے کی مناسبت یہ ہے کہ جو شخص اپنے کسی ذاتی فائدے کے بغیر محض اصلاح خلق کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ کام کر رہا ہے اس کی نیت پر حملہ کرتے ہوئے خدا سے ڈرو۔ اس بات کو اتنا ذور دے کر بیان کرنے کی وجہ یہ تھی کہ قوم کے سردار حضرت نوحؐ کی مخلصانہ دعوت حق میں کیڑے ڈالنے کے لیے ان پر یہ الزام لگاتے تھے کہ یہ شخص دراصل یہ ساری دوڑ دھوپ اپنی بڑائی کے لیے کر رہا ہے **يُرِيدُ أَنْ يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ** (المؤمنون، آیت 24)۔ یہ چاہتا ہے کہ تم پر فضیلت حاصل کرے۔

▲ سورۃ الشعرااء حاشیہ نمبر: 81

یہ لوگ جنہوں نے حضرت نوحؐ کو دعوت حق کا یہ جواب دیا، ان کی قوم کے سردار، شیوخ اور اشراف تھے، جیسا کہ دوسرے مقام پر اسی قصے کے سلسلے میں بیان ہوا ہے: **فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرَكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا نَرَكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُنَا بَادِئَ الرَّأْيِ، وَمَا نَرَى لَكُمْ**

عَلَيْنَا مِنْ فَضْلِ (ہود، آیت 27)۔ "اس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا ہمیں تو تم اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتے کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہاری پیروی صرف ان لوگوں نے بے سمجھے بوجھے اختیار کر لی ہے جو ہمارے ہاں کے اراذل ہیں، اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہو۔" اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوح پر ایمان لانے والے زیادہ تر غریب لوگ، چھوٹے چھوٹے پیشہ ور لوگ، یا ایسے نوجوان تھے جن کی قوم میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ رہے اونچے طبقہ کے بااثر اور خوش حال لوگ، تو وہ ان کی مخالفت پر کمر بستہ تھے اور وہی اپنی قوم کے عوام کو طرح طرح کے فریب دے دے کر اپنے پیچھے لگائے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں جو دلائل وہ حضرت نوح علیہ السلام کے خلاف پیش کرتے تھے ان میں سے ایک استدلال یہ تھا کہ اگر نوح کی دعوت میں کوئی وزن ہوتا تو قوم کے امراء علماء، مذہبی پیشواؤ، معززین اور سمجھدار لوگ اسے قبول کرتے۔ لیکن ان میں سے تو کوئی بھی اس شخص پر ایمان نہیں لایا ہے۔ اس کے پیچھے لگے ہیں ادنیٰ طبقوں کے چند نادان لوگ جو کوئی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ اب کیا ہم جیسے بلند پایہ لوگ ان بے شعور اور کمین لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جائیں؟

بعینہ یہی بات قریش کے کفار نبی ﷺ کے متعلق کہتے تھے کہ ان کے پیرویا تو غلام اور غریب لوگ ہیں یا چند نادان لڑکے، قوم کے اکابر اور معززین میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ ابوسفیان نے ہر قل کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بھی یہی کہا تھا کہ **تَبَعَهِ مِنَا الْمُسْعَفَاءُ وَالْمَسَاكِينُ** (محمد ﷺ کی پیروی ہمارے غریب اور کمزور لوگوں نے قبول کی ہے) گویا ان لوگوں کا طرز فکر یہ تھا کہ حق صرف وہ ہے جسے قوم کے بڑے لوگ حق مانیں کیونکہ وہی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، رہے چھوٹے لوگ، تو ان کا چھوٹا ہونا، ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے عقل اور ضعیف الرائے ہیں، اس لیے ان کا کسی بات کو مان لینا اور بڑے لوگوں کا رد کر دینا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک بے وزن بات ہے۔ بلکہ کفار مکہ تو اس سے بھی آگے

بڑھ کر یہ دلیل لاتے تھے کہ پیغمبر بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا، خدا کو اگر واقعی کوئی پیغمبر بھیجنा منظور ہوتا تو کسی بڑے رئیس کو بناتا، وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرِيَّتِينَ عَظِيمٌ (الزخرف، آیت 3) "وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ہمارے دونوں شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا"۔

▲ سورۃ الشعرااء حاشیہ نمبر: 82

یہ ان کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ان کے اعتراض کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ جو لوگ غریب، محنت پیشہ اور ادنیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والے ہیں یا معاشرے کے پست طبقات سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں کوئی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی، اور وہ علم و عقل اور سمجھ بوجھ سے عاری ہوتے ہیں، اس لیے نہ ان کا ایمان کسی فکر و بصیرت پر مبنی، نہ انکا اعتقاد لا کوئی اعتبار، اور نہ ان کے اعمال کا کوئی وزن۔ حضرت نوح علیہ السلام اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ جو شخص میرے پاس آ کر ایمان لاتا ہے اور ایک عقیدہ قبول کر کے اس کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے، اس کے اس فعل کی تھے میں کیا محرکات کام کر رہے ہیں اور وہ کتنی کچھ قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کا دیکھنا اور ان کا حساب لگانا تو خدا کام ہے، میرا اور تمہارا کام نہیں ہے۔

▲ سورۃ الشعرااء حاشیہ نمبر: 83

یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ ان کے اعتراض میں یہ بات بھی مضمرا تھی کہ ایمان لانے والوں کا جو گروہ حضرت نوح علیہ السلام کے گرد جمع ہو رہا ہے یہ چونکہ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات پر مشتمل ہے، اس لیے اونچے طبقوں میں سے کوئی شخص اس زمرے میں شامل ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اے نوح علیہ السلام کیا تم پر ایمان لا کر ہم اپنے آپ کو اراذل اور سفہاء میں شمار

کرائیں؟ کیا ہم غلاموں، نوکروں، مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کی صفات میں آبیٹھیں؟ حضرت نوح علیہ السلام اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ میں آخر یہ غیر معقول طرز عمل کیسے اختیار کر سکتا ہوں کہ جو لوگ میری بات نہیں مانتے ان کے تو پیچھے پھر تار ہوں اور جو میری بات مانتے ہیں انہیں دھکے دے کر نکال دوں۔ میری حیثیت تو ایک ایسے بے لاغ آدمی کی ہے جس نے علی الاعلان کھڑے ہو کر پکار دیا ہے کہ جس طریقے پر تم لوگ چل رہے ہو یہ باطل ہے اور اس پر چلنے کا انجام تباہی ہے، اور جس طریقے کی طرف میں رہنمائی کر رہا ہوں اسی میں تم سب کی نجات ہے۔ اب جس کا جی چاہے میری اس تنبیہ کو قبول کر کے سیدھے راستے پر آئے اور جس کا جی چاہے آنکھیں بند کر کے تباہی کی راہ چلتا رہے۔ میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو اللہ کے بندے میری اس تنبیہ کو سن کر سیدھا راستہ اختیار کرنے کے لیے میرے پاس آئیں ان کی ذات، برادری، نسب اور پیشہ پوچھوں اور اگر وہ آپ لوگوں کی نگاہ میں "کمین" ہوں تو ان کو واپس کر کے اس انتظار میں بیٹھا رہوں کہ "شریف"

حضرات کب تباہی کا راستہ چھوڑ کر نجات کی راہ پر قدم رنجہ فرماتے ہیں۔

ٹھیک یہی معاملہ ان آیات کے نزول کے زمانے میں نبی ﷺ اور کفار مکہ کے درمیان چل رہا تھا اور اسی کو نگاہ میں رکھنے سے یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ حضرت نوحؐ اور ان کی قوم کے سرداروں کی یہ گفتگو یہاں کیوں سنائی جا رہی ہے۔ کفار مکہ کے بڑے بڑے سردار نبی ﷺ سے کہتے تھے کہ ہم آخر بلال اور عمران اور صہیب جیسے غلاموں اور کام پیشہ لوگوں کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ ایمان لانے والوں کی صفات سے یہ غریب لوگ نکالے جائیں تب کوئی امکان اس کا نکل سکتا ہے کہ اشراف ادھر کا رخ کریں، ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ محمود اور ایاز ایک صفات میں کھڑے ہو جائیں۔ اس پر نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالکل صاف اور دوڑوک الفاظ میں یہ ہدایت دی گئی کہ حق سے منہ موڑنے والے متکبروں کی خاطر ایمان قبول کرنے والے غریبوں کو دھکے نہیں دیے جاسکتے:

آمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنْتَ لَهُ تَصْدِيٌ^٦ وَمَا عَلَيْكَ أَلَا يَرَىٰ^٧ وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَىٰ^٨ وَهُوَ يَخْشَىٰ^٩
فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهُ^{١٠} كَلَّا إِنَّهَا تَذَكِّرَةٌ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ۔ (عبس، آیات 5 تا 12)

اے محمد ﷺ، جس نے بے نیازی برتنی تم اس کے پچھے پڑتے ہو؟ حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے۔ اور جو تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اس حال میں کہ وہ اللہ سے ڈر رہا ہے، تم اس سے بے رخی بر تنتہ ہو؟ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدْوَةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ
مِّنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدُهُمْ فَتَكُونُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿٥٣﴾ وَكَذِلِكَ
فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّيَقُولُوا أَهُؤُلَاءِ مَنْ أَللَّهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ
بِالشُّكِّرِينَ ﴿٥٤﴾ (الانعام۔ آیت 53-52)۔

نہ دور پھینکو ان لوگوں کو جوشب و روز اپنے رب کو پکارتے ہیں محضر اس کی خوشنودی کی خاطر۔ ان کا کوئی حساب تمہارے ذمہ نہیں اور تمہارا کوئی حساب ان کے ذمہ نہیں۔ اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔ ہم نے تو اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے آزمائش میں ڈال دیا ہے تاکہ وہ کہیں "کیا ہمارے درمیان بس یہی لوگ رہ گئے تھے جن پر اللہ کا فضل و کرم ہوا؟" ہاں، کیا اللہ اپنے شاکر بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا۔

▲ سورۃ الشعرا، حاشیہ نمبر: 84

اصل الفاظ ہیں **تَكُونُنَ مِنَ الْمُرْجُومِينَ**۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم کو رجم کیا جائے گا، یعنی پتھر مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ تم پر ہر طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ کی

جائے گی، جہاں جاؤ گے دھنکارے اور پھٹکارے جاؤ گے۔ عربی محاورے کے لحاظ سے ان الفاظ کے یہ دونوں معنی لیے جاسکتے ہیں۔

▲ سورۃ الشعرااء حاشیہ نمبر: 85

یعنی آخری اور قطعی طور پر جھٹلا دیا ہے جس کے بعد اب کسی تصدیق وایمان کی امید باقی نہیں رہی۔ ظاہر کلام سے کوئی شخص اس شبہ میں نہ پڑے کہ بس پیغمبر اور سردار ان قوم کے درمیان اوپر کی گفتگو ہوئی اور ان کی طرف سے پہلی ہی تکذیب کے بعد پیغمبر نے اللہ تعالیٰ کے حضور رپورٹ پیش کر دی کہ یہ میری نبوت نہیں مانتے، اب آپ میرے اور ان کے مقدمہ کا فیصلہ فرمادیں۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس طویل کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوم کے اصرار علی الکفر کے درمیان صدیوں برپا رہی۔ سورہ عنکبوت میں بتایا گیا ہے کہ اس کشمکش کا زمانہ ساڑھے نو سو برس تک ممتد رہا ہے۔ **فَلِبِثَ فِيْهِمْ**

الْفَسَنَةِ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًاً۔ (آیت 14)۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس زمانہ میں پشت درپشت ان کے اجتماعی طرز عمل کو دیکھ کرنہ صرف یہ اندازہ فرمایا کہ ان کے اندر قبول حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے، بلکہ یہ رائے بھی قائم کر لی کہ آئندہ ان کی نسلوں سے بھی نیک اور ایماندار آدمیوں کے اٹھنے کی توقع نہیں ہے۔ **إِنَّكَ إِنْ تَذَرُ هُمْ يُضْلُلُوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُونَ إِلَّا فَاجِرًا كَفَارًا۔** (نوح، آیت 27)۔

اے رب اگر تو نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کر لیں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا فاجر اور سخت منکر حق ہو گا۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت نوح علیہ السلام کی اس رائے کو درست قرار دیا اور اپنے علم کامل و شامل کی بنیا پر فرمایا **لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ أَمَنَ فَلَا تَبْتَغِ إِيمَانَ الْمُجْرِمِينَ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ**

(ہود، آیت 36)۔ "تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے بس وہ لا چکے، اب کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ لہذا اب ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دے۔"

▲ سورۃ الشعراء حاشیہ نمبر: 86

یعنی صرف یہی فیصلہ نہ کر دے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون، بلکہ وہ فیصلہ اس شکل میں نافذ فرمائ کہ باطل پرست تباہ کریے جائیں اور حق پرست بچا لیے جائیں۔ یہ الفاظ کہ "مجھے اور میرے مومن ساتھیوں کو بچا لے" خود بخود اپنے اندر یہ مفہوم رکھتے ہیں کہ باقی لوگوں پر عذاب نازل کر اور انہیں حرف غلط کی طرح مٹا کر رکھ دے۔

▲ سورۃ الشعراء حاشیہ نمبر: 87

"بھری ہوئی کشتی" سے مراد یہ ہے کہ وہ کشتی ایمان لانے والے انسانوں اور تمام جانوروں سے بھر گئی تھی جن کا ایک ایک جوڑ اساتھ رکھ لینے کی ہدایت فرمائی گئی تھی۔ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ ہود، آیت

كَذَّبُتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٣٣﴾ إِذْ قَالَ رَهْمٌ أَخْوُهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٣٤﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ
 لَّا ﴿١٣٥﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٣٦﴾ وَمَا آتَئْلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ
 الْعَلِمِينَ ﴿١٣٧﴾ أَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِبْعٍ أَيْةً تَعْبَثُونَ ﴿١٣٨﴾ وَتَتَخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ
 وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَارِينَ ﴿١٣٩﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٤٠﴾ وَاتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُمْ بِمَا
 تَعْلَمُونَ ﴿١٤١﴾ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ ﴿١٤٢﴾ وَجَنَّتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٤٣﴾ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ
 يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٤٤﴾ قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوْ عَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَعِظِينَ ﴿١٤٥﴾ إِنْ هَذَا إِلَّا
 خُلُقُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٤٦﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿١٤٧﴾ فَكَذَّبُوهُ فَاهْلَكُنَّهُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَا يَةً طَّ وَمَا
 كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٤٨﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٤٩﴾

رکو ۶ >

عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔ **88** یاد کرو جبکہ ان کے بھائی ہوئے نے ان سے کہا تھا **89** ”کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تورب العالمین کے ذمہ ہے۔ یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحصل ایک یاد گار عمارت بناؤ لتے ہو **90**، اور بڑے بڑے قصر تعییر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ **91** اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبار بن کر ڈالتے ہو۔ **92** پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا ہے جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیے، اولادیں دیں، باغ دیے اور چشمے دیے۔ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔ ”انہوں نے جواب دیا، “تو نصیحت کریا نہ کر، ہمارے لیے سب یکساں ہے۔ یہ باتیں تو یوں نہیں ہوتی چلی آئی ہیں۔ **93** اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں۔ ”آخر کار انہوں نے اُسے جھٹلا دیا اور ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ **94**

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ مانے والے نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرارت زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ۶۷

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 88 ▲

تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات 65 تا 72۔ ہود، 50 تا 60۔ مزید برال اس قصہ کی تفصیلات کے لیے قرآن مجید کے حسب ذیل مقامات بھی نگاہ میں رہیں: حم السجدة آیات 13-16۔ الاحقاف، 21-26۔ الذاريات، 41-45۔ القمر 18-22۔ الحاقة 4-8۔ الفجر 6-8۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 89 ▲

حضرت ہود کی اس تقریر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس قوم کے متعلق وہ معلومات ہماری نگاہ میں رہیں جو قرآن مجید نے مختلف مقامات پر ہمیں بھی پہنچائی ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ :

قوم نوح کی تباہی کے بعد دنیا میں جس قوم کو عروج عطا کیا گیا وہ یہ تھی :

وَأَذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمٍ نُوحٍ۔ (الاعراف۔ آیت 69)

یاد کرو (اللہ کے اس فضل و انعام کو کہ) نوح کی قوم کے بعد اس نے تم کو خلیفہ بنایا۔
جسمانی حیثیت سے یہ بڑے تو مند اور زور آور لوگ تھے:

وَزَادَكُمْ فِي الْخُلُقِ بَصْطَةً (الاعراف، آیت 69) اور تمہیں جسمانی ساخت میں خوب تو مند کیا۔

اپنے دور میں یہ بے نظیر قوم تھی۔ کوئی دوسری قوم اس کی ٹکر کی نہ تھی:

الَّتِي لَمْ يُخْلِقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (الفجر، آیت 8)

جس کے مانند ملکوں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔

اس کا تمدن بڑا شاندار تھا، اوپرے اوپرے ستونوں کی بلند و بالا عمارتیں بنانا اس کی وہ خصوصیت تھی جس کے لیے وہ اس وقت کی دنیا میں مشہور تھی

: أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِنَادِ الفجر، (آیات 6-7)

تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے کیا کیا ستمونوں والے عاد ارم کے ساتھ؟

اس مادی ترقی اور جسمانی زور آوری نے ان کو سخت متكلب بنادیا تھا اور انہیں اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ تھا:

فَامَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا أَمَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً۔ (لحم السجدہ۔ آیت 15)

رہے عاد، تو انہوں نے زمین میں حق کی راہ سے ہٹ کر تکبر کی روشن اختیار کی اور کہنے لگے کہ کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔

ان کا سیاسی نظام چند بڑے بڑے جباروں کے ہاتھ میں تھا جن کے آگے کوئی دم نہ مار سکتا تھا:

وَاتَّبَعُوا آمْرَ كُلِّ جَبَارٍ عَنِيدٍ (ہود۔ آیت 59)

اور انہوں نے ہر جبار دشمن حق کے حکم کی پیروی کی۔
مذہبی حیثیت سے یہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکرنہ تھے، بلکہ شرک میں متلا تھے۔ ان کو اس بات سے انکار تھا کہ
بندگی صرف اللہ کی ہونی چاہیے:

قَالُوا آآجِئْتَنَا إِنَّا نَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ أَبَاؤُنَا۔ (الاعراف آیت 70)

انہوں نے (ہود سے) کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی بندگی کریں اور ان کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟

ان خصوصیات کو نظر میں رکھنے سے حضرت ہود علیہ السلام کی یہ تقریر دعوت اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 90 ▲

یعنی محض اپنی عظمت و خوشحالی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایسی عالی شان عمارتیں تعمیر کرتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں، جن کی کوئی حاجت نہیں، جن کا کوئی فائدہ اس کے سوانحیں کہ وہ بس تمہاری دولت و شوکت کی نمود کے لیے ایک نشانی کے طور پر کھڑی رہیں۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 91 ▲

یعنی تمہاری دوسری قسم کی تعمیرات ایسی ہیں جو اگرچہ استعمال کے لیے ہیں، مگر انکو شاندار، منزین اور مستخدم بنانے میں تم اس طرح اپنی دولت، محنت اور قابلیتیں صرف کرتے ہو جیسے دنیا میں ہمیشہ رہنے کا سامان کر رہے ہو، جیسے تمہاری زندگی کا مقصد بس یہیں کے عیش کا اہتمام کرنا ہے اور اس کے ماوراء کوئی چیز نہیں ہے۔ جس کی تتمہیں فکر ہو۔

اس سلسلے میں یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ بلا ضرورت یا ضرورت سے زیادہ شاندار عمارتیں بنانا کوئی منفرد فعل نہیں ہے جس کا ظہور کسی قوم میں اس طرح ہو سکتا ہو کہ اس کی اور سب چیزیں تو ٹھیک ہوں اور بس یہی ایک کام وہ غلط کرتی ہو۔ یہ صورت حال تو ایک قوم میں رونما ہی اس وقت ہوتی ہے جب ایک طرف اس میں دولت کی ریل پیل ہوتی اور دوسری طرف اس کے اندر نفس پرستی و مادہ پرستی کی شدت بڑھتے بڑھتے جنون کی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ حالت جب کسی قوم میں پیدا ہوتی ہے تو اس کا سارا ہی نظام تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی تعمیرات پر جو گرفت کی اس سے مقصود یہ نہیں تھا کہ ان کے نزدیک صرف یہ عمارتیں ہی بجائے خود قبل اعتراض تھیں، بلکہ دراصل وہ بحیثیت مجموعی ان کے فساد تمدن و تہذیب پر گرفت کر رہے تھے اور ان عمارتوں کا ذکر انہوں نے اس حیثیت سے کیا تھا کہ سارے ملک میں ہر طرف یہ بڑے بڑے پھوٹے اس فساد کی نمایاں ترین علامت کے طور پر ابھرے نظر آتے تھے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 92 ▲

یعنی اپنا معیار زندگی بلند کرنے میں تو تم اس قدر غلو کر گئے ہو کہ رہنے کے لیے تم کو مکان نہیں محل اور قصر در کار ہیں، اور ان سے بھی جب تمہاری تسلیم نہیں ہوتی تو بلا ضرورت عالی شان عمارتیں بنادا لتے ہو جن کا کوئی مصرف اظہار وقت و ثروت کے سوا نہیں ہے۔ لیکن تمہارا معیار انسانیت اتنا گرا ہوا ہے کہ کمزوروں کے لیے تمہارے دلوں میں کوئی رحم نہیں، غریبوں کے لیے تمہاری سرزی میں کوئی انصاف نہیں، گرد و پیش کی ضعیف قویں ہوں یا خود اپنے ملک کے پست طبقات، سب تمہارے جبرا اور ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں اور کوئی تمہاری چیرہ دستیوں سے بچا نہیں رہ گیا ہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 93 ▲

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہ آج کوئی نئی چیز نہیں ہے، صدیوں سے ہمارے باپ دادا یہی کچھ کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہی ان کا دین تھا، یہی ان کا تمدن تھا اور ایسے ہی ان کے اخلاق اور معاملات تھے۔ کون سی آفت ان پر ٹوٹ پڑی تھی کہ اب ہم اس کے ٹوٹ پڑنے کا اندیشه کریں۔ اس طرز زندگی میں کوئی خرابی ہوتی تو پہلے ہی وہ عذاب آچکا ہوتا جس سے تم ڈراتے ہو۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو باتیں تم کر رہے ہو ایسی ہی باتیں پہلے بھی بہت سے مذہبی خبطی اور اخلاق کی باتیں بگھارنے والے کرتے رہے ہیں، مگر دنیا کی گاڑی جس طرح چل رہی تھی اسی طرح چلے جا رہی ہے۔ تم جیسے لوگوں کی باتیں نہ ماننے کا یہ نتیجہ کبھی برآمد نہ ہوا کہ یہ گاڑی کسی صدمہ سے دوچار ہو کر الٹ گئی ہوتی۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 94 ▲

اس قوم کے ہلاک ہونے کی جو تفصیل قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اچانک زور کی آندھی اٹھی۔ یہ لوگ دور سے اس کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھ کر سمجھے کہ گھٹا چھائی ہے۔ خوشیاں منانے لگے کہ اب خوب بارش ہو گی۔ مگر وہ تھا خدا کا عذاب۔ آٹھ دن اور سات راتوں تک مسلسل ایسی طوفانی ہوا چلتی رہی جس

نے ہر چیز کو تباہ کر ڈالا۔ اس کے زور کا یہ عالم تھا کہ اس نے آدمیوں کو اٹھا اٹھا کر چینک دیا۔ اس کی گرمی و خشکی کا یہ حال تھا کہ جس چیز پر گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔ اور یہ طوفان اس وقت تک نہ تھا جب تک اس ظالم قوم کا ایک ایک تنفس ختم نہ ہو گیا۔ بس ان کی بستیوں کے کھنڈر ہی ان کے انجام کی داستان سنانے کے لیے کھڑے رہ گئے۔ اور آج کھنڈر بھی باقی نہیں ہیں۔ احफاف کا پورا علاقہ ایک خوفناک ریگستان بن چکا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہم القرآن، جلد چہارم، الاحفاف، حاشیہ 25)۔

كَذَّبُتْ شَمُودُ الْمُرْسِلِينَ ﴿١﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخْوَهُمْ صَلَوةً أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٣٢﴾ إِنِّي نَكُمْ رَسُولُ أَمِينٍ
 لَّا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٣٣﴾ وَمَا آتَئْلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ
 الْعَلَمِينَ ﴿١٣٤﴾ أَتُرَكُونَ فِي مَا هُنَّا أَمِينِينَ ﴿١٣٥﴾ فِي جَنَّتٍ وَّعِيُونِ ﴿١٣٦﴾ وَزُرُوفٍ وَّخَلِ
 طَلْعَهَا هَضِيمٌ ﴿١٣٧﴾ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فِرِهِينَ ﴿١٣٨﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٣٩﴾ وَ
 لَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ﴿١٤٠﴾ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿١٤١﴾ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ
 مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿١٤٢﴾ مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا ﴿١٤٣﴾ فَأَتَ بِأَيَّةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿١٤٤﴾ قَالَ
 هَذِهِ نَاقَةٌ لَهَا شِرْبٌ وَنَكْمٌ شَرْبٌ يَوْمٌ مَعْلُومٌ ﴿١٤٥﴾ وَلَا تَمْسُوهَا بِسُوءٍ فَيَا خُذْكُمْ عَذَابٌ
 يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٤٦﴾ فَعَقَرُوهَا فَاصْبَحُوا نَدِيمِينَ ﴿١٤٧﴾ فَاخْذَهُمُ الْعَذَابُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَاءِهٗ وَمَا
 كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٤٨﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٤٩﴾

دکو ۸

ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ **95** یاد کرو جبکہ ان کے بھائی صالحؑ نے ان سے کہا ”کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ **96** اللہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تورب العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم اُن سب چیزوں کے درمیان، جو یہاں ہیں، بس یوں ہی اطمینان سے رہنے دیے جاؤ گے؟ **97** ان باغوں اور چشموں میں؟ ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ **98** تم پہاڑ کھود کر فخریہ اُن میں عمارتیں بناتے ہو۔ **99** اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اُن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جوز میں میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔ **100** ”انہوں نے جواب دیا ”تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے۔ **101** تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے۔ لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے۔“ **102** صالحؑ نے کہا ”یہ اونٹنی ہے۔ **103** ایک دن اس کے پینے کا ہے اور ایک دن تم سب کے پانی لینے کا۔ **104** اس کو ہرگز نہ چھیڑنا اور نہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آئے گا۔“ مگر انہوں نے اس کی کوچیں کاٹ دیں **105** اور آخر کار پچھتا تے رہ گئے۔ عذاب نے انہیں آیا۔ **106**

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرارب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ ۸۶

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 95 ▲

تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات 73 تا 79۔ ہود، 61۔ 68۔ الحجر، 80۔ 84۔ بنی اسرائیل 59۔ مزید تفصیلات کے لیے قرآن مجید کے حسب ذیل مقامات بھی پیش نظر ہیں: النمل، 45۔ 53۔ الذاريات، 43۔ 45۔ القمر، 31۔ 23۔ الحاقة، 4۔ 5۔ النجح، 9۔ الشمس، 11۔

اس قوم کے متعلق قرآن مجید میں مختلف مقامات پر جو تصریحات کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عاد کے بعد جس قوم کو عروج عطا کیا وہ یہی تھی، **جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ** (الاعراف آیت 74) مگر اس کی تمدنی ترقی نے بھی بالآخر وہی شکل اختیار کی جو عاد کی ترقی نے کی تھی، یعنی معیار زندگی بلند سے بلند تراور معیار آدمیت پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف میدانی علاقوں میں عالی شان قصر اور پہاڑوں میں ایلو را اور اجنہ کے غاروں جیسے مکان بن رہے تھے۔ دوسری طرف معاشرے میں شرک و بت پرستی کا زور تھا اور زمین خلمن و ستم سے لبریز ہو رہی تھی۔ قوم کے بدترین مفسدوں اس کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ اونچے طبقے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں سرشار تھے۔ حضرت صالحؐ کی دعوت حق نے اگر اپیل کیا تو نچلے طبقے کے کمزور لوگوں کو کیا۔ اونچے طبقوں نے اسے مانے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ **إِنَّا بِالّذِي أَمَنَّتُمْ بِهِ كُفَّرُونَ**، جس چیز پر تم ایمان لائے ہو اس کو ہم نہیں مان سکتے۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 96 ▲

حضرت صالحؐ کی امانت و دیانت اور غیر معمولی قابلیت کی شہادت خود اس قوم کے لوگوں کی زبان سے قرآن مجید ان الفاظ میں نقل کرتا ہے **قَالُوا يَصَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوا قَبْلَ هَذَا**۔ (ہود۔ آیت 62) "انہوں نے کہا اے صالحؐ کی اسلام، اس سے پہلے تو تم ہمارے درمیان ایسے آدمی تھے جس سے ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔"

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 97 ▲

یعنی کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ تمہارا یہ عیشِ دائی اور ابدی ہے؟ کیا اس کو کبھی زوال آنا نہیں ہے؟ کیا تم سے کبھی ان نعمتوں کا حساب نہ لیا جائے گا اور کبھی ان اعمال کی باز پرس نہ ہو گی جن کا تم ارتکاب کر رہے ہو؟

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 98 ▲

اصل میں لفظ **هَضِيمٌ** استعمال ہوا ہے جس سے مراد کھجور کے ایسے خوشے ہیں جو بچلوں سے لد کر جھک گئے ہوں اور جن کے پھل پکنے کے بعد نرمی اور رطوبت کی وجہ سے پھٹے پڑتے ہوں۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 99 ▲

جس طرح عاد کے تمدن کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ اونچے اونچے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے، اس طرح شمود کے تمدن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت، جس کی بناء پر وہ قدیم زمانے کی قوموں میں مشہور تھے، یہ تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عمارتیں بناتے تھے۔ چنانچہ سورہ فجر میں جس طرح عاد کو **ذَاتُ الْعِيَاد** (ستونوں والے) کا لقب دیا گیا ہے اسی طرح شمود کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے کہ **آلَّذِينَ جَاءُوا الصَّحْرَ بِالْوَادِ**، "وہ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی ہیں"۔ اس کے علاوہ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہاں میدانی علاقوں میں بھی بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے تھے، **تَتَخَذُونَ مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا**۔ (الاعراف۔ آیت 74)۔ اور ان تعمیرات کی غرض و غایت کیا تھی؟ قرآن اس پر لفظ **فِرِهِينَ** سے روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ اپنی بڑائی، اپنی دولت و قوت اور اپنے کمالات فن کی نمائش کے لیے تھا، کوئی حقیقی ضرورت ان کے لیے داعی نہ تھی۔ ایک بگڑے ہوئے تمدن کی شان یہی ہوتی ہے۔ ایک طرف معاشرے کے غریب لوگ سرچھپانے تک کوڑھنگ کی جگہ نہیں پاتے۔ دوسری طرف امراء اور اہل

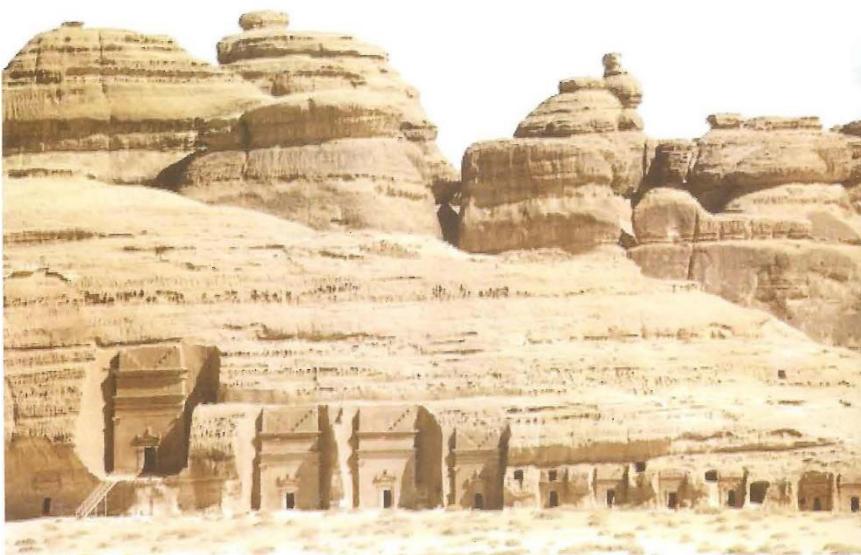
ثروت رہنے کے لیے جب ضرورت سے زیادہ محل بنانچکتے ہیں تو بلا ضرورت نمائش یا دگاریں تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

شمود کی ان عمارتوں میں سے کچھ اب بھی باقی ہیں جنہیں 1959 کے دسمبر میں میں نے خود دیکھا ہے۔ مقابل کے صفحات میں ان کی کچھ تصویریں دی جاری ہیں۔ یہ جگہ مدینہ طیبہ اور تبوک کے درمیان حجاز کے مشہور مقام العلاء (جسے عہد نبوی میں وادی القری کہا جاتا تھا) سے چند میل کے فاصلے پر بجانب شمال واقع ہے۔ آج بھی اس جگہ کو مقامی باشندے الحجر اور مدائن صالح کے ناموں ہی سے یاد کرتے ہیں۔ اس علاقے میں العلاء تو اب بھی ایک نہایت سر سبز و شاداب وادی ہے جس میں کثرت سے چشمے اور باغات ہیں، مگر الحجر کے گرد و پیش بڑی نحوضت پائی جاتی ہے۔ آبادی برائے نام ہے۔ روئیدگی بہت کم ہے۔ چند کنوئیں ہیں۔ انہی میں سے ایک کنوئیں کے متعلق مقامی آبادی میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ حضرت صالحؐ کی اونٹنی اسی سے پانی پیتی تھی۔ اب وہ ترکی عہد کی ایک ویران چھوٹی سی فوجی چوکی کے اندر پایا جاتا ہے اور بالکل خشک پڑا ہے (اس کی تصویر بھی مقابل کے صفحات میں دی جا رہی ہے۔ اس علاقے میں جب ہم داخل ہوئے تو العلاء کے قریب پہنچتے ہی ہر طرف ہمیں ایسے پہاڑ نظر آئے جو بالکل کھیل کھیل ہو گئے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی سخت ہولناک زلزلے نے انہیں سطح زمین سے چوٹی تک جھنجور کر قاش کا شکر کر رکھا ہے (ان پہاڑوں کی بھی کچھ تصویریں مقابل کے صفحات پر دی جا رہی ہیں)۔ اسی طرح کے پہاڑ ہمیں مشرق کی طرف العلاء سے خیبر جاتے ہوئے تقریباً 50 میل تک اور شمال کی طرف ریاست اردن کے حدود میں 30-40 میل اندر تک ملتے چلے گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تین چار سو میل لمبا اور 100 میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے ایک زلزلہ عظیم نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

العلا کے پہاڑ



مدائن صالح کے پہاڑ



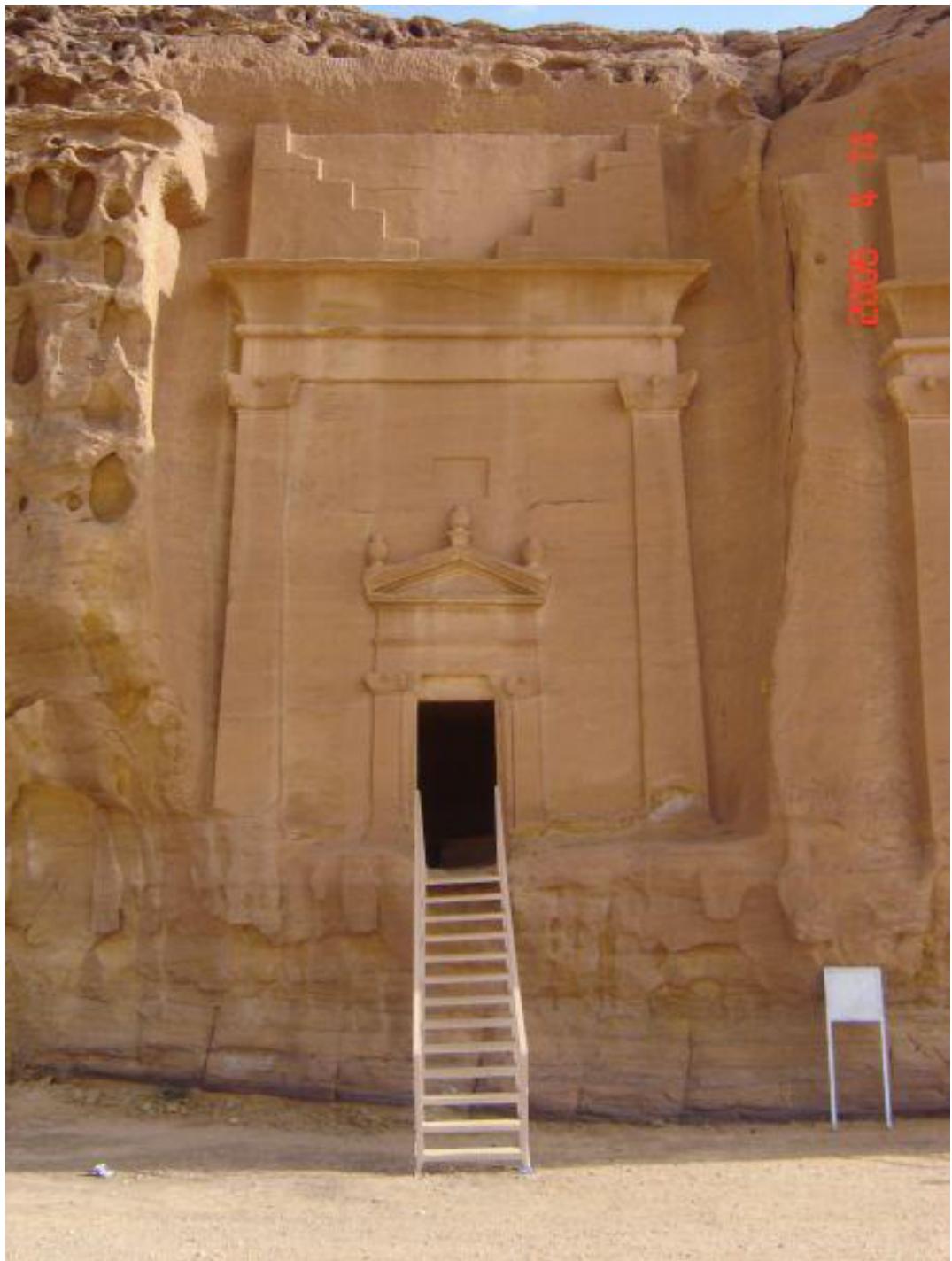
مداویں صالح کی چند شہودی عمارتیں



مداوں صالح کی چند شہودی عمارتیں



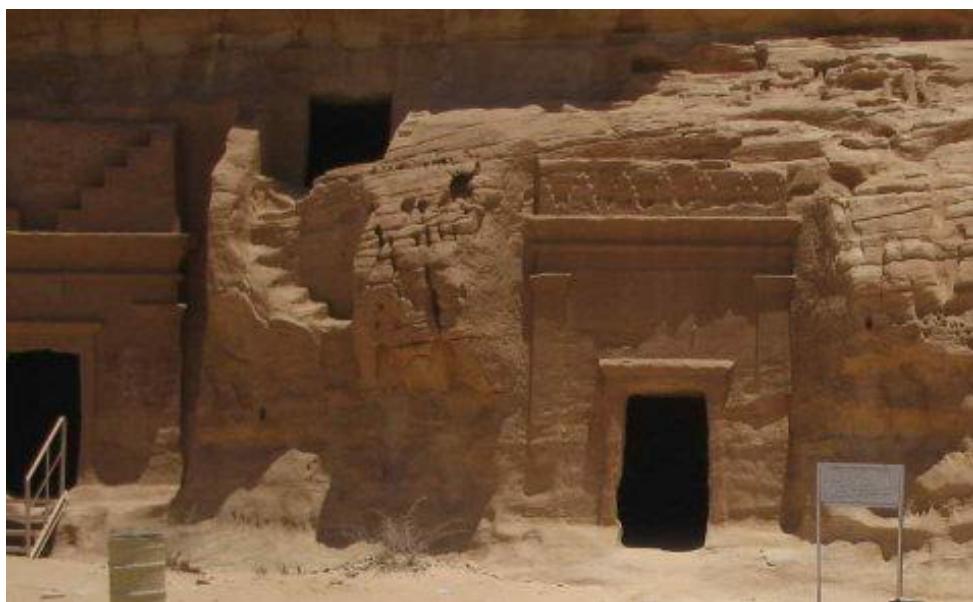
مدائن صالح میں خمودی عمارت



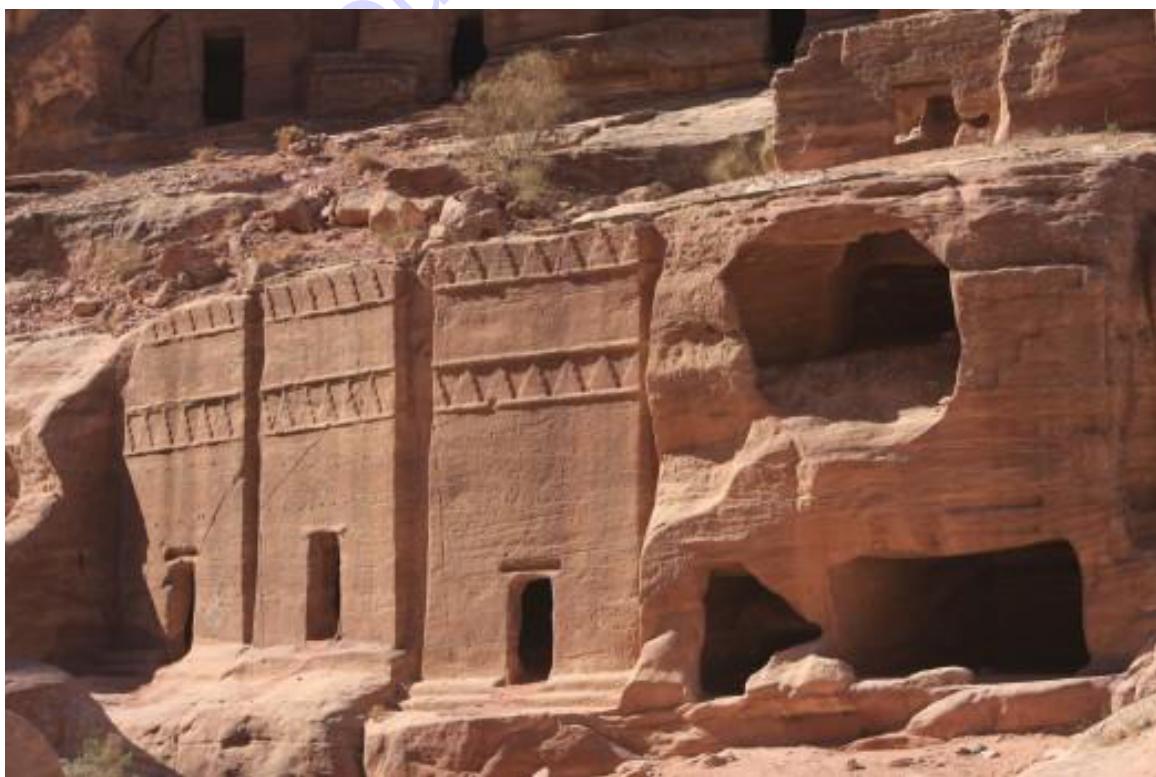
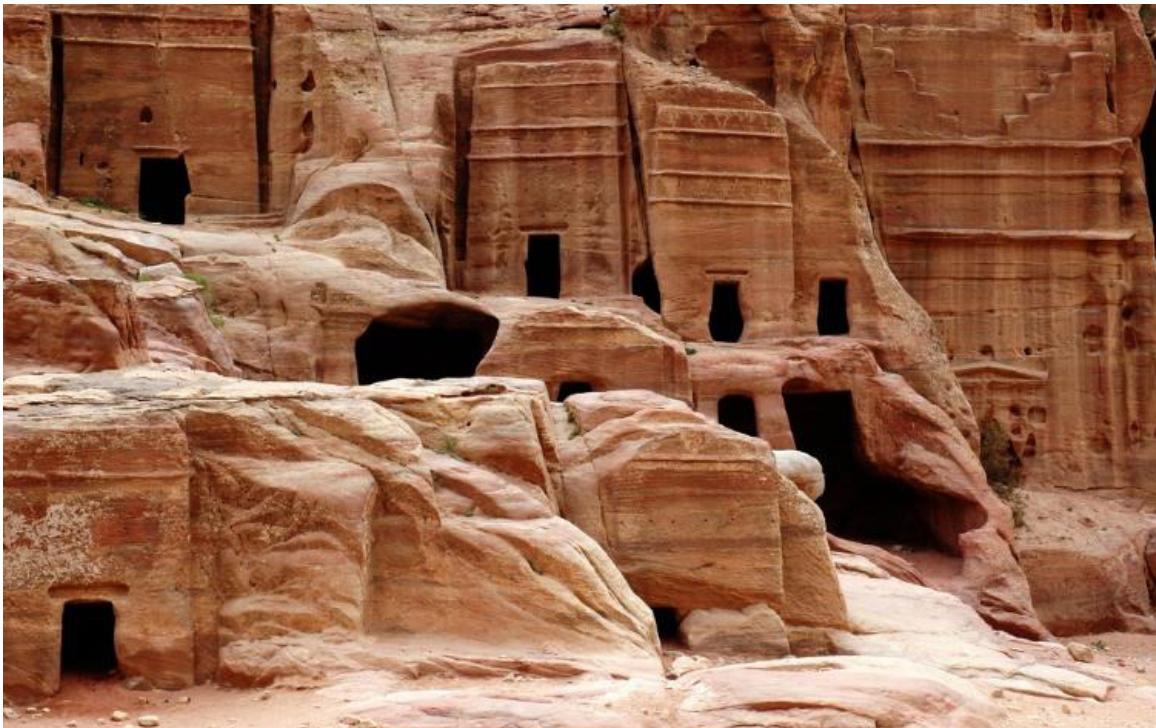
مدائن صالح میں شہودی طرز کی عمارت



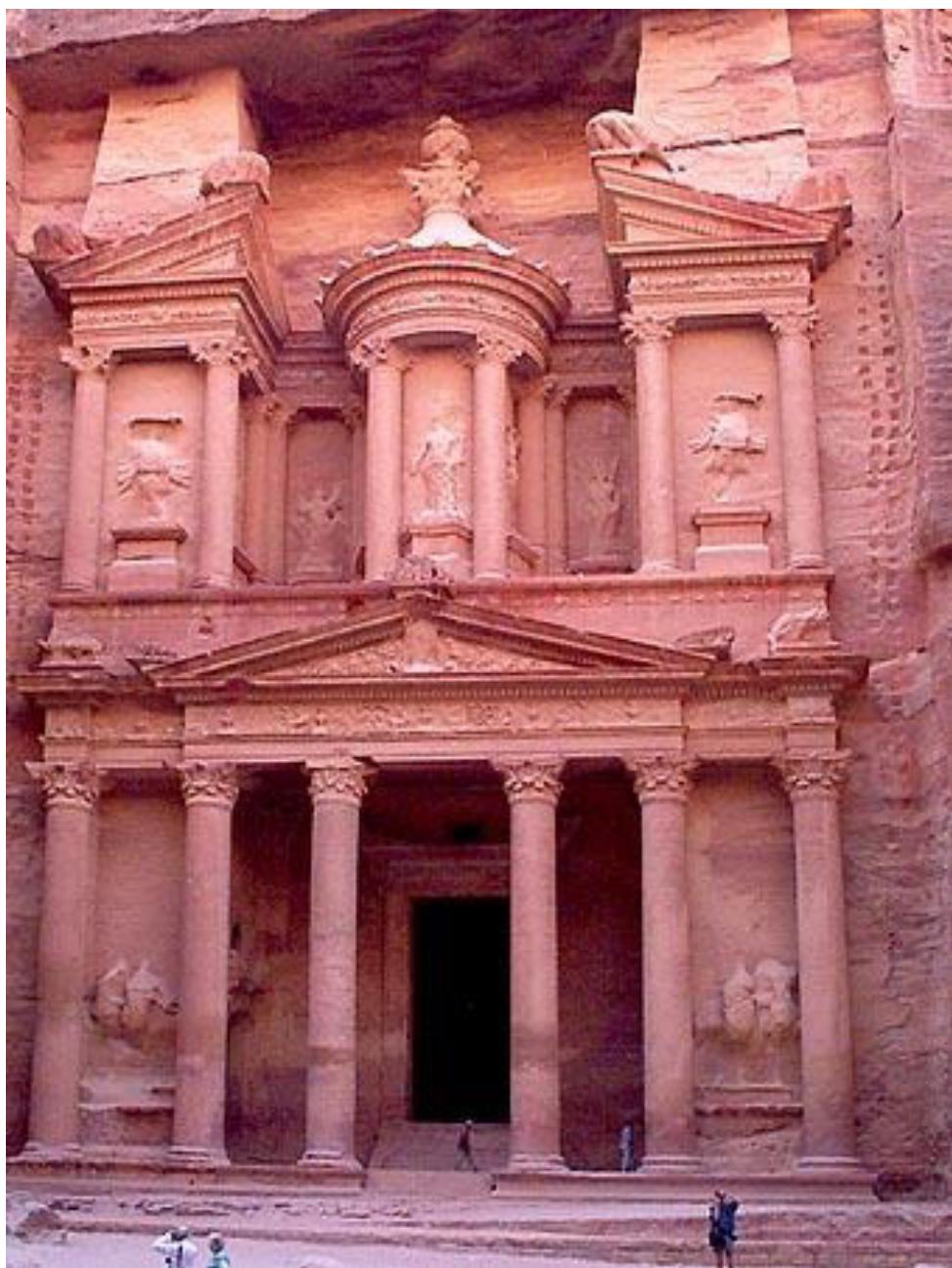
مدائن صالح میں شہودی عمارت



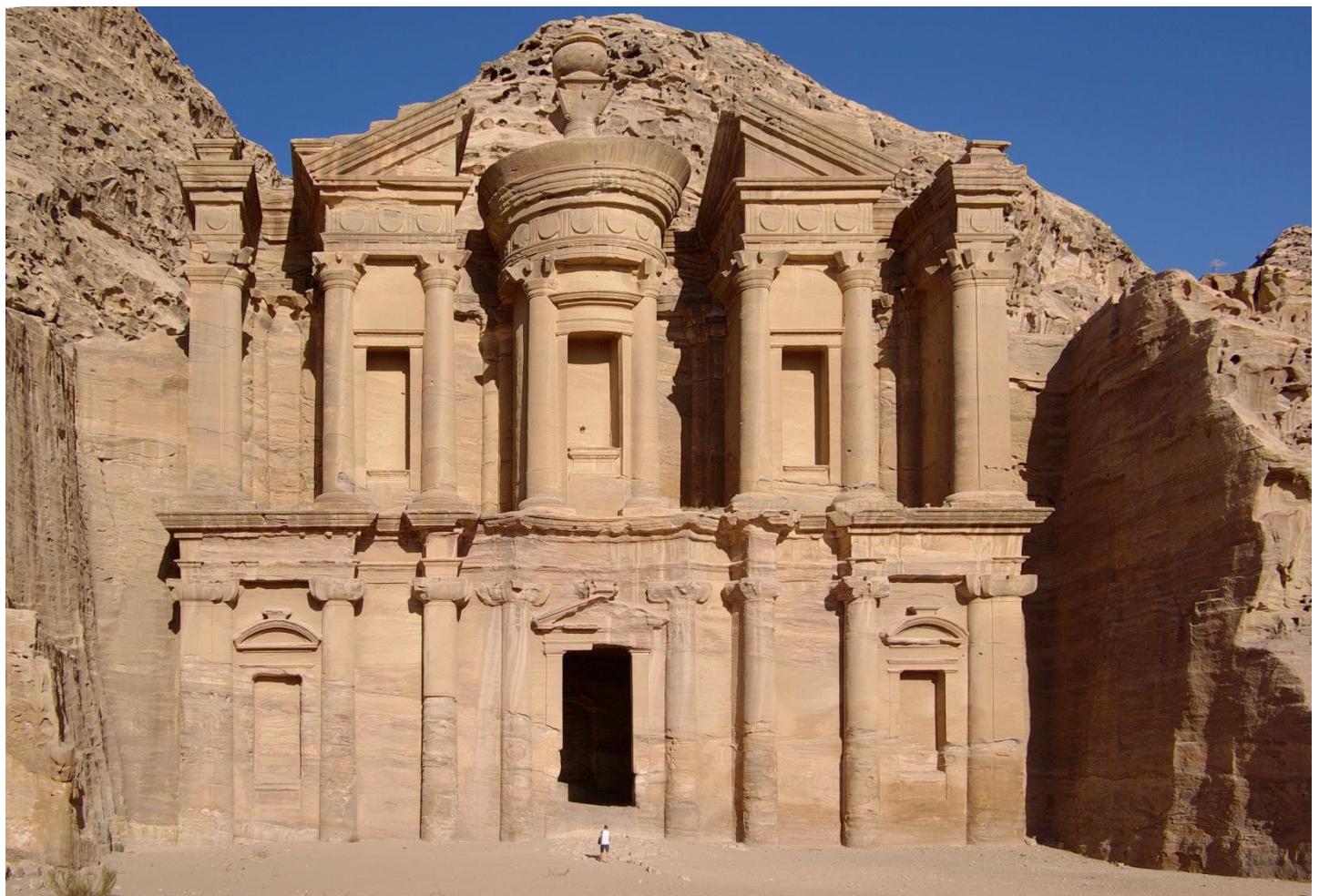
پیڑا میں شہودی طرز کی عمارت



پیڑا میں نبھی طرز کی ایک عمارت



پیٹرا میں نبطی طرز کی ایک عمارت



مدائن صالح میں ترکی عہد کی فوجی چوکی (قلعہ اسلامیہ) کے رد میان وہ کنوں جس پر حضرت صالحؑ کی اوٹنی پانی پینتی تھی۔



مدائن صالح میں ترکی عہد کی فوجی چوکی (قلعہ اسلامیہ) کے رد میان واقع وہ کنوال جس پر حضرت صالحؐ کی اوٹھنی پانی پینت تھی۔



شمود کی جو عمارتیں ہم نے الجھر میں دیکھی تھیں، اسی طرح کی چند عمارتیں ہم کو خلائق عقبہ کے کنارے مدین کے مقام پر، اور اردن کی ریاست میں پٹرا (Petra) کے مقام پر بھی ملیں۔ خصوصیت کے ساتھ پڑا میں شمود کی عمارت اور نبطیوں کی بنائی ہوئی عمارت پہلوہ بہ پہلو موجود ہیں اور ان کی تراش خراش اور طرزِ تعمیر میں اتنا نمایاں فرق ہے کہ ہر شخص ایک نظر دیکھ کر ہی سمجھ سکتا ہے کہ یہ دونوں نہ ایک زمانے کی ہیں اور نہ یہ ایک ہی قوم کا طرزِ تعمیر ہے (ان کے الگ الگ نمونوں کی تصویریں بھی ہم نے مقابل کے صفحات میں دی ہیں)۔ انگریز مستشرق ڈائلی (Daughty) قرآن کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے الجھر کی عمارت کے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ شمود کی نہیں بلکہ، نبطیوں کی بنائی ہوئی عمارت ہیں۔ لیکن دونوں قوموں کی عمارت کا فرق اس قدر واضح ہے کہ ایک اندھا ہی انہیں ایک قوم کی عمارت کہہ سکتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پہاڑ تراش کر ان کے اندر عمارتیں بنانے کا فن شمود سے شروع ہوا، اس کے ہزاروں سال بعد نبطیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح میں اسے عروج پر پہنچایا، اور پھر ایلورہ میں (جس کے غار پڑا اسے تقریباً سات سو برس بعد کے ہیں) یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 100 ▲

یعنی اپنے ان امراء و رؤسائے اور ان رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی قیادت میں تمہارا یہ فاسد نظام زندگی چل رہا ہے۔ یہ مسرف لوگ ہیں، اخلاق کی ساری حدیں پھاند کر شتر بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ جس نظام کو چلانیں گے اس میں بگاڑ ہی پھیلے گا۔ تمہارے لیے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا تری پیدا کرو اور مفسدوں کی اطاعت چھوڑ کر میری اطاعت کرو، کیونکہ میں خدا کا رسول ہوں، میری امانت و دیانت کو تم پہلے سے جانتے ہو، اور میں ایک بے غرض آدمی ہوں، اپنے کسی ذاتی فائدے کے لیے اصلاح کا یہ کام کرنے نہیں اٹھا ہوں۔۔۔۔۔ یہ تھا وہ مختصر منشور

جو حضرت صالح عليه السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس میں صرف مذہبی تبلیغ ہی نہ تھی، تمدنی و اخلاقی اصلاح اور سیاسی انقلاب کی دعوت بھی ساتھ موجود تھی۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 101 ▲

"سحر زدہ" یعنی دیوانہ و مجنون، جس کی عقل ماری گئی ہو۔ قدیم تصورات کے مطابق پاگل پن یا توکسی جن کے اثر سے لاحق ہوتا تھا یا جادو کے اثر سے۔ اس لیے وہ جسے پاگل کہنا چاہتے تھے اس کو یا تو "مجنون" کہتے تھے یا مسحور اور مسخر۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 102 ▲

یعنی بظاہر تو ہم میں اور تجھ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ ہم تجھے خدا کا فرستادہ مان لیں۔ لیکن اگر تو اپنے مامور من اللہ اور مرسل من جانب اللہ ہونے کے دعوے میں سچا ہے تو کوئی ایسا محسوس مجزہ پیش کر جس سے ہمیں یقین آجائے کہ واقعی کائنات کے خالق اور زمین و آسمان کے مالک نے تجھ کو ہمارے پاس بھیجا ہے۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 103 ▲

مجزے کے مطالبے پر اونٹنی پیش کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض ایک عام اونٹنی نہ تھی جیسی ہر عرب کے پاس وہاں پائی جاتی تھی، بلکہ ضرور اس کی پیدائش اور اس کے ظہور میں یا اس کی خلقت میں کوئی ایسی چیز تھی جسے مجزے کی طلب پر پیش کرنا معقول ہوتا۔ اگر حضرت صالح اس مطالبے کے جواب میں یوں ہی کسی اونٹنی کو پکڑ کے کھڑا کر دیتے تو ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت فضول حرکت ہوتی جس کی کسی پیغمبر تو در کنار، ایک عام معقول آدمی سے بھی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات یہاں تو صرف سیاق کلام ہی کے اقتداء سے سمجھ میں آتی ہے، لیکن دوسرے مقامات پر قرآن میں صراحةً اس اونٹنی کے وجود کو مجزہ کہا گیا ہے۔ سورہ اعراف اور سورہ ہود میں فرمایا گیا: **هذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ تَكْمِيلٌ**، "یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی کے طور پر ہے"۔ اور سورہ بنی اسرائیل میں اس سے بھی زیادہ پر زور الفاظ میں ارشاد ہوا ہے :

وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرِسِّلَ بِالْأُلَيْتِ إِلَّا أَنَّ كَذَبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ، وَأَتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً
فَظَلَمُوا بِهَا وَمَا نُرِسِّلُ بِالْأُلَيْتِ إِلَّا تَخْوِيفًا (آیت 59)

ہم کو نشانیاں بھیجنے سے کسی چیز نے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ پہلے لوگ ان کو جھٹلا کچے ہیں اور ہم شمود کے سامنے آنکھوں دیکھتے اونٹنی لے آئے پھر بھی انہوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا۔ نشانیاں تو ہم خوف دلانے ہی کے لیے بھیجتے ہیں (تماشا دکھانے کے لیے تو نہیں بھیجتے)۔

اس پر مزید وہ چیلنج ہے جو اونٹنی کو میدان میں لے آنے کے بعد اس کافر قوم کو دیا گیا۔ اس کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ صرف ایک مجرم ہی پیش کر کے ایسا چیلنج دیا جا سکتا تھا۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 104 ▲

یعنی ایک دن تنہایہ اونٹنی تمہارے کنوں اور چشموں سے پانی پیے گے اور ایک دن ساری قوم کے آدمی اور جانور پیسیں گے۔ خبردار، اس کی باری کے دن کوئی شخص پانی لینے کی جگہ پھٹکنے نہ پائے۔ یہ چیلنج بجائے خود نہایت سخت تھا۔ لیکن عرب کے مخصوص حالات میں تو کسی قوم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا چیلنج ہو نہیں سکتا تھا۔ وہاں تو پانی ہی کے مسئلے پر خون خرابے ہو جاتے تھے، قبیلہ قبیلے سے لڑ جاتا تھا اور جان جو کھوں کی بازی لگا کر کسی کنوں میں یا چشمے سے پانی لینے کا حق حاصل کیا جاتا تھا۔ اس سر زمین میں کسی شخص کا اٹھ کر یہ کہہ دینا کہ ایک دن میری اکیلی اونٹنی پانی پیے گی اور باقی ساری قوم کے آدمی اور جانور صرف دوسرے دن ہی پانی لے سکیں گے، یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ دراصل پوری قوم کو لڑائی کا چیلنج دے رہا ہے۔ ایک زبردست لشکر کے بغیر کوئی آدمی عرب میں یہ بات زبان سے نہ نکال سکتا تھا اور کوئی قوم یہ بات اس وقت تک نہ سن سکتی تھی جب تک وہ اپنی آنکھوں سے یہ نہ دیکھ رہی ہو کہ چیلنج دینے والے کی پشت پر اتنے شمشیر زن اور تیر انداز موجود ہیں جو مقابلے پر اٹھنے والوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔ لیکن حضرت صالح نے بغیر کسی لاو لشکر کے تھا اٹھ کر یہ چیلنج

اپنی قوم کو دیا اور قوم نہ صرف یہ کہ اس کو کان لٹکا کر سنا بلکہ بہت دنوں تک ڈر کے مارے وہ اس کی تعیل بھی کرتی رہی۔

سورہ اعراف اور سورہ ہود میں اس پر اتنا اضافہ اور ہے کہ **هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ تَكُُمُ الْيَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلُ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمْسُوهَا بِسُوءٍ**، "یہ اللہ کی او نٹنی تمہارے لیے نشانی کے طور پر ہے، چھوڑ دو اسے کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے، ہر گز اسے برے ارادے سے نہ چھونا"۔ یعنی چیلنج صرف اتنا ہی نہ تھا کہ ہر دوسرے روز اکیلی یہ او نٹنی دن بھر سارے علاقے کے پانی کی اجارہ دار رہے گی، بلکہ اس پر مزید یہ چیلنج بھی تھا کہ یہ تمہارے کھیتوں اور باغوں اور نخلستانوں اور چڑاگا ہوں میں دندناتی پھرے گی، جہاں چاہے گی جائے گی، جو کچھ چاہے گی کھائے گی، خبردار جو کسی نے اسے چھیرا۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 105 ▲

یہ مطلب نہیں ہے کہ جس وقت انہوں نے حضرت صالحؑ سے یہ چیلنج سنا اسی وقت وہ او نٹنی پر پل پڑے اور اس کی کوچیں کاٹ ڈالیں، بلکہ کافی مدت تک یہ او نٹنی ساری قوم کے لیے ایک مسئلہ بنی رہی، لوگ اس پر دلوں میں او نٹنے رہے، مشورے ہوتے رہے، اور آخر کار ایک من چلے سردار نے اس کام کا بیڑا اٹھایا کہ وہ قوم کو اس سے نجات دلائے گا۔ سورہ شمس میں اس شخص کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے **إِذَا نُبَعِثَ أَشْقَاهَا**،"

جبکہ اٹھا اس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی"۔ اور سورہ قمر میں فرمایا گیا ہے **فَنَادُوا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ**" انہوں نے اپنے رفیق سے اپیل کی، آخر کار وہ یہ کام اپنے ذمہ لے کر اٹھا اور اس نے کوچیں کاٹ ڈالیں

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 106 ▲

قرآن میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب اونٹنی مار ڈالی گئی تو حضرت صالح علیہ السلام نے اعلان کیا تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَثَةَ آيَٰ مِ، "تین دن اپنے گھروں میں مزے کر لو" (ہود، آیت 65)۔ اس نوٹس کی مدت ختم ہونے پر رات کے پچھلے پھر صحیح کے قریب ایک زبردست دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ایسا سخت زلزلہ آیا جس نے آن کی آن میں پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ صحیح ہوئی تو ہر طرف اس طرح کچلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں جیسے باڑے کی باڑھ میں لگی ہوئی سو کھی جھاڑیاں جانوروں کی آمد و رفت سے پاماں ہو کر رہ گئی ہوں۔ نہ ان کے سنگین قصر انہیں اس آفت سے بچا سکنے نہ پہاڑوں میں کھو دے ہوئے غار۔ **إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمُ الْمُحْتَظِرِ** (القمر، آیت 31) **فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جُثَمِينَ** (اعراف، آیت 78) **فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ هُمَا أَغْنَى عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكُسِبُونَ** (الحجر، آیات 83-84)۔

٩٦ رَكْوَتْ

كَذَّبُتْ قَوْمٌ لُّوْطٍ الْمُرْسِلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخْوَهُمْ لُّوْطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي نَكُمُ رَسُولًا
 أَمِينًا ۝ لَا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْعَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرٍ لِلَّا عَلَى رَبِّ
 الْعِلَمِينَ ۝ أَتَأُتُونَ الذِّكْرَانَ مِنَ الْعِلَمِينَ ۝ وَتَذَرُّونَ مَا خَلَقَ رَبُّكُمْ مِنْ
 آزْوَاجِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَدُوْنَ ۝ قَالُوا إِنَّا لَمْ تَنْتَهِ يُلْوُطُ لَتَكُونُنَّ مِنَ الْمُخَرِّجِينَ
 قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُمْ مِنَ الْقَالِينَ ۝ رَبِّنَا نَحْنُ وَآهْلِنَا يَعْمَلُونَ ۝ فَنَجِّنْهُ وَآهْلَهُ
 أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغُبَرِينَ ۝ ثُمَّ دَمَرْنَا الْأَخْرِينَ ۝ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا
 فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِينَ ۝ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَاءً ۝ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ
 لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝

لُوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلا�ا۔ **107** یاد کرو جبکہ ان کے بھائی لُوط نے ان سے کہا تھا ”کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تورب العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو **108** اور تمہاری بیویوں میں تمہارے رب نے تمہارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو؟ **109** بلکہ تم لوگ توحد سے ہی گزر گئے ہو۔ **110** ”انہوں نے کہا ”اے لُوط، اگر تو ان بالوں سے باز نہ آیا تجو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں اُن میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا۔ **111** ”اس نے کہا ”تمہارے کر تو توں پر جو لوگ گُڑھ رہے ہیں میں اُن میں شامل ہوں۔ اے پروردگار، مجھے اور میرے اہل و عیال کو ان کی بد کرداریوں سے نجات دے۔ **112** ”آخر کار ہم نے اسے اور اس کے سب اہل و عیال کو بچالیا، بجز ایک بُڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔ **113** پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے تباہ کر دیا اور ان پر بر سائی ایک برسات، بڑی بڑی بارش تھی جو ان ڈرائے جانے والوں پر نازل ہوئی۔ **114**

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرارت زبردست بھی ہے اور رحم بھی۔ ۶۹

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 107 ▲

تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات 80 تا 84۔ ہود، 74 تا 83۔ الحجہ 57 تا 77۔ الانبیاء 71 تا 75 انمل 54 تا 58۔ العنكبوت 28۔ 35۔ الصافات 133 تا 138۔ القمر 33 تا 39۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 108 ▲

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ساری مخلوق میں سے صرف مردوں کو تم نے اس غرض کے لیے چھانٹ لیا ہے کہ ان سے خواہش نفس پوری کرو حالانکہ دنیا میں بکثرت عورتیں موجود ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا بھر میں ایک تم ہی ایسے لوگ ہو جو شہوت رانی کے لیے مردوں کے پاس جاتے ہو، ورنہ انسانوں میں کوئی دوسری قوم ایسی نہیں ہے، بلکہ حیوانات میں سے بھی کوئی جانور یہ کام نہیں کرتا۔ اس دوسرے مفہوم کی صراحت سورہ اعراف اور سورہ عنکبوت میں یوں کی گئی ہے: **أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَ كُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَلَيِّينَ** "کیا تم وہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جو دنیا کی مخلوق میں سے کسی نے تم سے پہلے نہیں کیا؟"

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 109 ▲

اس کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے جو بیویاں خدا نے پیدا کی تھیں انہیں چھوڑ کر تم غیر فطری ذریعے یعنی مردوں کا اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود ان بیویوں کے اندر خدا نے اس خواہش کی تکمیل کا جو فطری راستہ رکھا تھا اسے چھوڑ کر تم غیر فطری راستہ اختیار کرتے ہو۔ اس دوسرے مطلب میں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ وہ ظالم لوگ اپنی عورتوں سے بھی خلاف وضع فطری فعل کا ارتکاب کرتے تھے۔ بعید نہیں کہ وہ یہ حرکت خاندانی منصوبہ بندی کی خاطر کرتے ہوں۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 110 ▲

یعنی تمہارا صرف یہی ایک جرم نہیں ہے۔ تمہاری زندگی کا تو سارا انحراف ہی حد سے زیادہ بگڑ چکا ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کے اس عام بگاڑ کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے: **أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ** (النمل آیت 54)۔ "کیا تمہارا یہ حال ہو گیا ہے کہ کھلمن کھلا دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے فخش کام کرتے ہو؟" **أَيْتَكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ** (العنکبوت آیت 29)۔ "کیا تم ایسے بگڑے گئے ہو کہ مردوں سے مباشرت کرتے ہو، راستوں پر ڈاکے مارتے ہو، اور اپنی مجلسوں میں علانیہ برے کام کرتے ہو؟" (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الحجر، حاشیہ 39)۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 111 ▲

یعنی تجھے معلوم ہے کہ اس سے پہلے جس نے بھی ہمارے خلاف زبان کھولی ہے یا ہماری حرکتوں پر احتجاج کیا ہے، یا ہماری مرضی کے خلاف کام کیا ہے، وہ ہماری بستیوں سے نکالا گیا ہے۔ اب اگر تو یہ باتیں کرے گا تو تیرا حشر بھی ایسا ہی ہو گا۔ سورہ اعراف اور سورہ نمل میں بیان ہوا ہے کہ حضرت لوٹ علیہ السلام کو یہ نوٹس دینے سے پہلے اس شریر قوم کے لوگ آپس میں یہ طے کر چکے تھے کہ **أَخْرِجُوا أَلَّا نُؤْطِ مِنْ قَرِيَّتِكُمْ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَتَظَاهِرُونَ** "لوٹ علیہ السلام اور اس کے خاندان والوں اور ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔ ان " صالحین " کو باہر کارستہ دکھاؤ۔"

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 112 ▲

اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں ان کے اعمال بد کے برے انجام سے بچا۔ اور یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ اس بد کردار بستی میں جو اخلاقی گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کی چھوٹ کہیں ہماری آل اولاد کو نہ لگ

جائے، اہل ایمان کی اپنی نسلیں کہیں اس بگڑے ہوئے ماحول سے متاثر نہ ہو جائیں، اس لیے اے پروردگار، ہمیں اس ہر وقت کے عذاب سے نجات دے جو اس ناپاک معاشرے میں زندگی بسر کرنے سے ہم پر گزر رہا ہے۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 113 ▲

اس سے مراد حضرت لوٹ علیہ السلام کی بیوی ہے۔ سورہ تحریم میں حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوٹ کی بیویوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ **كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَاحِبِينَ فَخَانَتُهُمَا** (آیت 10)۔ "یہ دونوں عورتیں ہمارے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں مگر انہوں نے ان کے ساتھ خیانت کی"۔ یعنی دونوں ایمان سے خالی تھیں اور اپنے نیک شوہروں کا ساتھ دینے کے بجائے ان دونوں نے اپنی کافر قوم کا ساتھ دیا۔ اسی بنا پر جب اللہ تعالیٰ نے قوم لوٹ علیہ السلام پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا اور حضرت لوٹ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے اہل و عیال کو لے کر اس علاقے سے نکل جائیں تو ساتھ ہی یہ بھی ہدایت فرمادی کہ اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جاؤ، **فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيلِ وَلَا يَلْتَفِتُ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرًا تَكَلَّفَ إِنَّهُ مُصِيبَهَا مَا آصَابَهُمْ** (ہود آیت 81)۔ "پس تو کچھ رات رہے اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکل جا اور تم میں سے کوئی پچھے پلت کرنہ دیکھے۔ مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جا، اس پر وہی کچھ گزرنی ہے جو ان لوگوں پر گزرنی ہے"۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 114 ▲

اس بارش سے مراد پانی کی بارش نہیں بلکہ پتھروں کی بارش ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت لوٹ جب رات کے پچھلے پھر اپنے بال بچوں کو لے کر نکل گئے تو صحیح پوچھتے ہی یا کیا ایک زور کا دھماکا ہوا) **فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ** ، ایک ہولناک

زلزلے نے ان کی بستیوں کو تمل پٹ کر کے رکھ دیا: **جَعَلْنَا عَالِيَّهَا سَافِلَهَا**، ایک زبردست آتش فشانی انفجار سے ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر بر سائے گئے) **وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا بَحَارَةً مِنْ سِجِيلٍ مَنْضُودٍ** اور ایک طوفانی ہوا سے بھی ان پر پتھر اور کیا گیا: **إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا**.

بائیبل کے بیانات، قدیم یونانی اور لاطینی تحریروں، جدید زمانے کی طبقات الارضی تحقیقات اور آثار قدیمہ کے مشاہدات سے اس عذاب کی تفصیلات پر جو روشنی پڑتی ہے اس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

بھیرہ مردار (Dead Sea) کے جنوب اور مشرق میں جو علاقہ آج انتہائی ویران اور سنسان حالت میں پڑا ہوا ہے، اس میں بکثرت پرانی بستیوں کے کھنڈروں کی موجودگی پتہ دیتی ہے کہ یہ کسی زمانہ میں نہایت آباد علاقہ رہا تھا۔ آج وہاں سینکڑوں بر باد شدہ قریوں کے آثار ملتے ہیں، حالانکہ اب یہ علاقہ اتنا شاداب نہیں ہے کہ اتنی آبادی کا بوجھ سہار سکے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس علاقے کی آبادی و خوشحالی کا دور قبل مسیح سے 1900 قبائل مسیح تک رہا ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق مورخین کا اندازہ یہ ہے کہ وہ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں گزرے ہیں۔ اس لحاظ سے آثار کی شہادت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ یہ علاقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے عہد ہی میں بر باد ہوا ہے۔

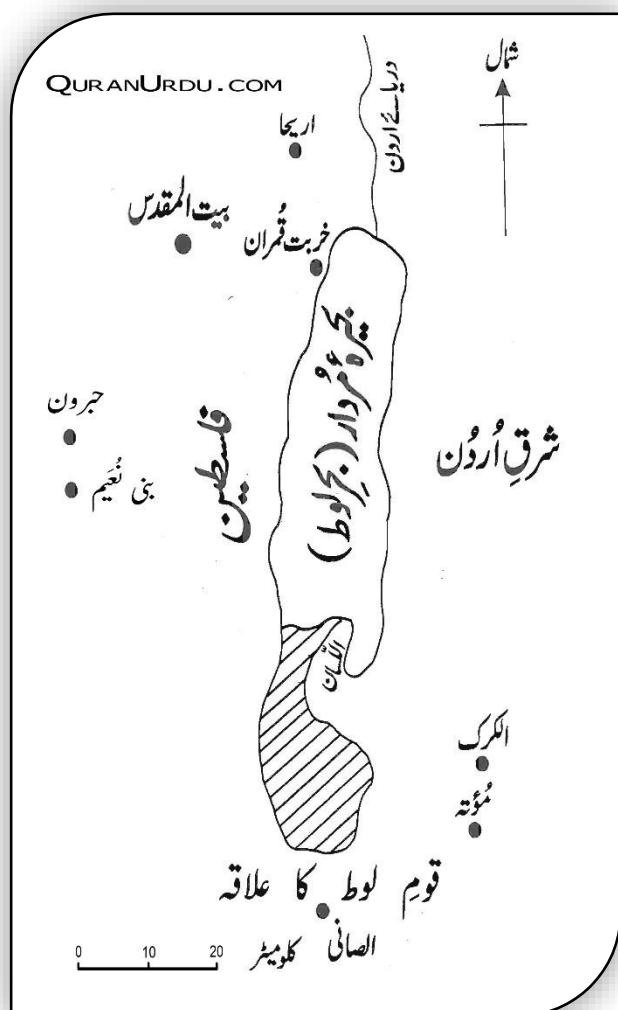
اس علاقے کا سب سے زیادہ آباد اور سر سبز و شاداب حصہ وہ تھا جسے بائیبل میں "سِدِیْم کی وادی" کہا گیا ہے، جس کے متعلق بائیبل کا بیان ہے کہ "وہ اس سے پیشتر خداوند نے سدوم اور عمورہ کو تباہ کیا، خداوند کے باغ (عدن) اور مصر کے مانند خوب سیراب تھی" (پیدائش، باب 13۔ آیت 10)۔ موجودہ زمانے کے محققین کی عام رائے یہ ہے کہ وہ وادی اب بھیرہ مردار کے اندر غرق ہے، اور یہ رائے مختلف آثار کی شہادتوں سے قائم کی

گئی ہے۔ قدیم زمانہ میں، بھیرہ مردار جنوب کی طرف اتنا وسیع نہ تھا جتنا اب ہے۔ شرق اردن کے موجودہ شہر الکرک کے سامنے مغرب کی جانب اس بھیرے میں جو ایک چھوٹا سا جزیرہ نما "اللسان" پایا جاتا ہے، قدیم زمانے میں بس یہی پانی کی آخری سرحد تھی۔ اس کے نیچے کا حصہ جہاں اب پانی پھیل گیا ہے (جسے ماحقہ نقشے میں ہم نے آڑی لکیروں سے نمایاں کیا ہے) پہلے ایک سرسبز وادی کی شکل میں آباد تھا اور یہی وہ وادی سدیم

تھی جس میں قوم لوط علیہ السلام کے بڑے بڑے شہر سدوم، عمورہ، ادمہ، ضبوئم اور ضغر واقع تھے۔ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے یہ وادی پھٹ کر دب گئی اور بھیرہ مردار کا پانی اس کے اوپر چھا گیا۔ آج بھی یہ بھیرے کا سب سے زیادہ اتحلا حصہ ہے، مگر رومی عہد میں یہ اتنا اتحلا تھا کہ لوگ اللسان سے مغربی ساحل تک چل کر پانی میں سے گزر جاتے تھے۔ اس وقت تک جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبے ہوئے جنگلات صاف نظر آتے ہیں۔ بلکہ یہ شبہ بھی کیا جاتا ہے کہ پانی میں کچھ عمارت ڈوبی ہوئی ہیں۔

بائبل اور قدیم یونانی ولاطینی تحریروں سے معلوم ہوتا

ہے کہ اس علاقے میں جگہ جگہ نفت (پٹرول) اور اسفلٹ کے گڑھے تھے اور بعض بعض زمین سے آتش گیر گیس بھی نکلتی تھی۔ اب بھی وہاں زیر زمین پٹرول اور گیسوں کا پتہ چلتا ہے۔



طبقات الارض مشاہدات سے اندازہ کیا گیا ہے کہ زلزلے کے شدید جھٹکوں کے ساتھ پڑول، گیس اور اسفالت زمین سے نکل کر بھڑک اٹھے اور سارا علاقہ بھڑک سے اڑ گیا۔ بائبل کا بیان ہے کہ اس تباہی کی اطلاع پا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام جب حبرون سے اس وادی کا حال دیکھنے آئے تو زمین سے دھواں اس طرح اٹھ رہا تھا جیسے بھٹی کا دھواں ہوتا ہے (پیدائش باب 19۔ آیت 28)۔

كَذَّبَ أَصْحَابُ نَعِيَّكَةِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٢﴾ إِذْ قَالَ رَبُّهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَقَوَّنَ ﴿٣﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ
 أَمِينٌ ﴿٤﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿٥﴾ وَمَا آتَسْلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ
 الْعَلَمِينَ ﴿٦﴾ أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ﴿٧﴾ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ
 الْمُسْتَقِيمِ ﴿٨﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٩﴾ وَاتَّقُوا
 الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِيلَةَ الْأَوَّلَيْنَ ﴿١٠﴾ قَالُوا إِنَّا أَنَا مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿١١﴾ وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ
 مِّثْلُنَا وَإِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكُذَّابِينَ ﴿١٢﴾ فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ
 الصَّادِقِينَ ﴿١٣﴾ قَالَ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظِّلَّةِ إِنَّهُ
 كَانَ عَذَابَ يَوْمِ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً ۝ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿١٦﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ
 لَهُ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝

رکو ۱۰

صحابہ الائیلہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔ **115** یاد کرو جبکہ شعیبؑ نے ان سے کہا تھا ”کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر توربۃ العالمین کے ذمہ ہے۔ پیانے ٹھیک بھرو اور کسی کو گھاٹانہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو اور اُس ذات کا خوف کرو جس نے تمہیں اور گزشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے۔“ انہوں نے کہا ”تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے، اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا، اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے۔“ شعیبؑ نے کہا ”میرا رب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ **116**“ انہوں نے اُسے جھٹلا دیا، آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آگیا **117**، اور وہ بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا۔

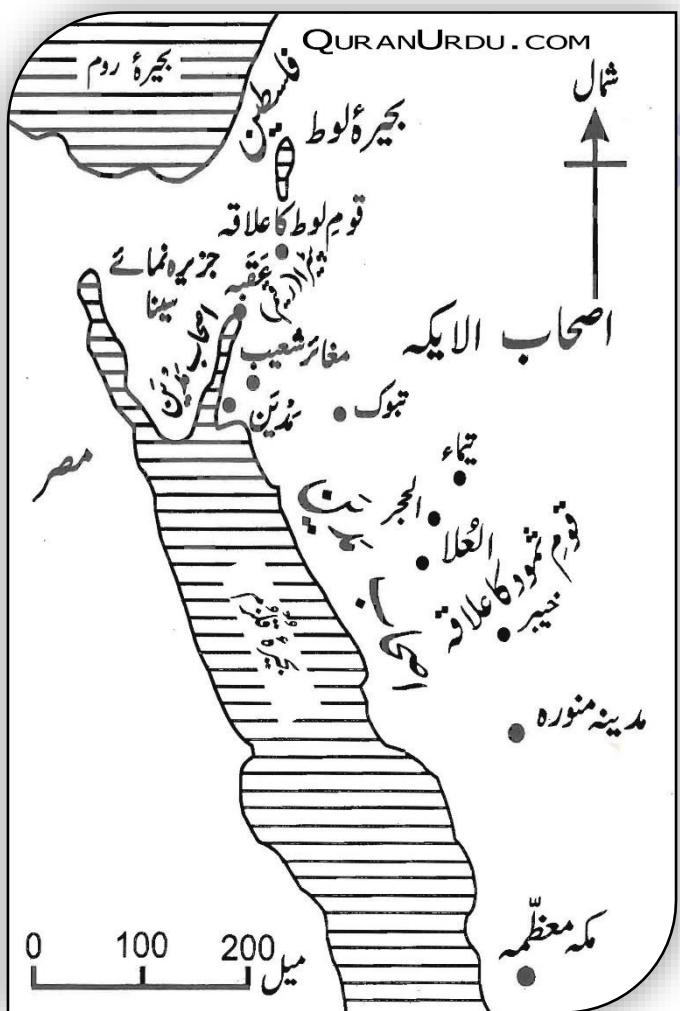
یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحمٰم بھی۔ ۶۰۴

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 115 ▲

اصحاب الائکیہ کا مختصر ذکر سورہ الحجر آیت 78-84 میں پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیامدین اور اصحاب الائکیہ الگ الگ قومیں ہیں یا ایک ہی قوم کے دونام ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں اور اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سورہ اعراف میں حضرت شعیب علیہ السلام کو اہل مدین کا بھائی فرمایا گیا ہے (فَإِنَّ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا)، اور یہاں اصحاب الائکیہ کے ذکر میں صرف یہ ارشاد ہوا ہے کہ اذْقَالَ رَهْمُ شُعَيْبٍ (جبکہ ان

سے شعیب نے کہا)، "ان کے بھائی" (أَخُوهُمْ)

کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس بعض مفسرین دونوں کو ایک ہی قوم قرار دیتے ہیں، کیونکہ سورہ اعراف اور سورہ ہود میں جو امراض اور اوصاف اصحاب مدین کے بیان ہوئے ہیں وہی یہاں اصحاب الائکیہ کے بیان ہو رہے ہیں، حضرت صالح کی دعوت و نصیحت بھی یکساں ہے، اور آخر کار ان کے انجام میں بھی فرق نہیں ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اقوال اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اصحاب مدین اور اصحاب الائکیہ بلاشبہ دو الگ قبیلے ہیں مگر ہیں ایک ہی نسل کی دو شاخیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو اولاد



ان کی بیوی یا کنیز قطورا کے بطن سے تھی وہ عرب اور اسرائیل کی تاریخ میں بنی قطورا کے نام سے معروف ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ جو سب سے زیادہ مشہور ہوا، مدیان بن ابراہیم کی نسبت سے مدیانی، یا اصحاب مدین کہلا یا، اور اس کی آبادی شمالی حجاز سے فلسطین کے جنوب تک اور وہاں سے جزیرہ نما یہ سینا کے آخری گوشے تک بحر قلزم اور خلیج عقبہ کے سواحل پر پھیل گئی۔ اس کا صدر مقام شہر مدین تھا جس کی جائے وقوع ابو الفدائن خلیج عقبہ کے مغربی کنارے ایلہ (موجودہ عقبہ) سے پانچ دن کی راہ پر بتائی ہے۔ باقی بنی قطورا جن میں بنی ودان (Dedanites) نسبتے زیادہ مشہور ہیں، شمالی عرب میں یہاں اور تبوک اور العلاء کے درمیان آباد ہوئے اور ان کا صدر مقام تبوک تھا جسے قدیم زمانے میں ایکہ کہتے تھے۔ (یاقوت نے مجسم البلدان میں لفظ ایکہ کے تحت بتایا ہے کہ یہ تبوک کا پرانا نام ہے اور اہل تبوک میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ یہی جگہ کسی زمانے میں ایکہ تھی)۔

اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کے لیے ایک ہی پیغمبر مبعوث کیے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے، اور ان کے علاقے بھی بالکل ایک دوسرے سے متصل تھے۔ بلکہ بعد نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد ہوں اور آپس کے شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی باہم گھل مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ بنی قطور کی ان دونوں شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا۔ اور دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی بے ایمانیاں اور مذہبی و اخلاقی یہماریاں پائی جاتی تھیں۔ بائبل کی ابتدائی کتابوں میں جگہ جگہ یہ ذکر ملتا ہے کہ یہ لوگ بعل فعور کی پرستش کرتے تھے اور بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر ان کے علاقے میں آئے تو ان کے اندر بھی انہوں نے شرک اور زنا کاری کی وبا پھیلادی (گنتی، باب 25 آیت 1-5، باب 31 آیت 16-17)۔ پھر یہ لوگ بین الاقوامی تجارت کی ان دو بڑی شاہراہوں پر آباد تھے جو یمن سے شام اور خلیج فارس سے مصر کی طرف جاتی تھیں۔ ان شاہراہوں پر واقع ہونے کی وجہ سے انہوں نے بڑے پیانے پر

رہنی کا سلسلہ چلا رکھا تھا۔ دوسری قوموں کے تجارتی قافلوں کو بھاری خراج لیے بغیر نہ گزرنے دیتے تھے، اور بین الاقوامی تجارت پر خود قابض رہنے کی خاطر انہوں نے راستوں کا امن خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ قرآن مجید میں ان کی اس پوزیشن کو یوں بیان کیا گیا ہے: **إِنَّهُمَا لِبِإِمَامٍ مُّبِينٍ** "یہ دونوں (قوم لوط اور اصحاب الائیکہ) کھلی شاہراہ پر آباد تھے" ، اور ان کی رہنی کا ذکر سورہ اعراف میں اس طرح کیا گیا ہے: **وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ** "اور ہر راستے پر لوگوں کو ڈرانے نہ بیٹھو"۔ یہی اسباب تھے جن کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قبیلوں کے لیے ایک ہی پیغمبر بھیجا اور ان کو ایک ہی طرح کی تعلیم دی۔ حضرت شعیب علی السلام اور اہل مدین کے قصہ کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف، آیات 85-93۔ ہود 84-95۔ العنكبوت 36-37۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 116 ▲

یعنی عذاب نازل کرنا میرا کام نہیں ہے۔ یہ تو اللہ رب العالمین کے اختیار میں ہے اور وہ تمہارے کرتوت دیکھ ہی رہا ہے۔ اگر وہ تمہیں اس عذاب کا مستحق سمجھے گا تو خود نازل فرمادے گا۔ اصحاب الائیکہ کے اس مطالبے اور حضرت صالحؐ کے اس جواب میں کفار قریش کے لیے بھی ایک تنبیہ تھی۔ وہ بھی رسول اللہ ﷺ سے یہی مطالبے کرتے تھے، **أَوْ تُسْقِطَ السَّيَّاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسْفًا**، "یا پھر گرادے ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے"۔ (بنی اسرائیل۔ آیت 92)۔ اس لیے ان کو سنایا جا رہا کہ ایسا ہی مطالبه اصحاب الائیکہ نے اپنے پیغمبر سے کیا تھا، اس کا جواب انہیں ملا وہی محمد ﷺ کی طرف سے تمہاری طلب کا جواب بھی ہے۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 117 ▲

اس عذاب کی کوئی تفصیل قرآن مجید میں یا کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ ظاہر الفاظ سے جوبات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ آسمانی عذاب مانگا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک بادل بھیج دیا اور وہ چھتری کی طرح ان پر اس وقت تک چھایا رہا جب تک باران عذاب نے ان کو بالکل تباہ نہ کر دیا۔ قرآن سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب مدین کے عذاب کی کیفیت اصحاب الائکہ کے عذاب سے مختلف تھی۔ یہ جیسا کہ یہاں بتایا گیا ہے، چھتری والے عذاب سے ہلاک ہوئے، اور ان پر عذاب ایک دھماکے اور زلزلے کی شکل میں آیا) **فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجَفَةُ فَاصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَثِيلِينَ**، اور **وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَثِيلِينَ**۔ اس لیے ان دونوں کو ملا کر ایک داستان بنانے کی کوشش درست نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے عذاب یوم الظلہ کی کچھ تشریحات بیان کی ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کی معلومات کامخذ کیا ہے۔ ابن جریر نے حضرت عبد اللہ بن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ **مِنْ حَدِيثِكَ مِنْ الْعَلَيَاءِ مَا عَذَابَ يَوْمَ الظَّلَّةِ فَكَذَبَهُ**، "علماء میں سے جو کوئی تم سے بیان کرے کہ یوم الظلہ کا عذاب کیا تھا اس کو درست نہ سمجھو"۔

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلٌ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٩٣﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٤﴾ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ
 الْمُذَدِّرِينَ ﴿١٩٥﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيًّا مُبِينٍ ﴿١٩٦﴾ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٩٧﴾ أَوْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَةً أَنْ
 يَعْلَمُهُ عُلِّمُوا بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿١٩٨﴾ وَلَوْنَزَلْنَاهُ عَلَى بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ﴿١٩٩﴾ فَقَرَأَهُ عَلَيْهِمْ مَا كَانُوا
 بِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٠٠﴾ كَذَلِكَ سَلَكْنَاهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ﴿٢٠١﴾ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ حَتَّى يَرَوُا
 الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٢٠٢﴾ فَيَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٠٣﴾ فَيَقُولُوا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُونَ
 أَفِيَعْذَابُنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿٢٠٤﴾ أَفَرَءَيْتَ إِنْ مَتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ﴿٢٠٥﴾ ثُمَّ جَاءَهُمْ مَا كَانُوا
 يُوعَدُونَ ﴿٢٠٦﴾ مَا أَغْنَى عَنْهُمْ مَا كَانُوا يُمْتَعِنُونَ ﴿٢٠٧﴾ وَمَا أَهْلَكَنَا مِنْ قَرِيَةٍ إِلَّا لَهَا
 مُنْذِرُونَ ﴿٢٠٨﴾ ذُكْرِي شَوَّهَ مَا كُنَّا ظَلِيمِينَ ﴿٢٠٩﴾ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيْطِينُ ﴿٢١٠﴾ وَمَا يَنْبَغِي
 لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيُّونَ ﴿٢١١﴾ إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْرُوفُونَ ﴿٢١٢﴾ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا أَخْرَ
 فَتَكُونُ مِنَ الْمُعَذَّبِينَ ﴿٢١٣﴾ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴿٢١٤﴾ وَاحْفُضْ جَنَاحَكَ لِمَنْ
 اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢١٥﴾ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِئٌ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢١٦﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ
 الرَّحِيمِ ﴿٢١٧﴾ الَّذِي يَرِيكَ حِينَ تَقُومُ ﴿٢١٨﴾ وَتَقْلِبَكَ فِي السُّجُودِينَ ﴿٢١٩﴾ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ
 الْعَلِيمُ ﴿٢٢٠﴾ هَلْ أُتِئُكُمْ عَلَى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيْطِينُ ﴿٢٢١﴾ تَنَزَّلُ عَلَى كُلِّ أَفَّالِكِ أَثِيمٍ ﴿٢٢٢﴾ يُلْقِيُونَ

السَّمْعَ وَ أَكْثُرُهُمْ كُذِبُونَ ﴿٢٣﴾ وَ الشُّعْرَاءُ يَتَبَعُهُمُ الْغَاوَةَ ﴿٢٤﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ
 يَهِيمُونَ ﴿٢٥﴾ وَ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ﴿٢٦﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّلِحَاتِ وَ
 ذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَ انتَصَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا وَ سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ

يَنْقَلِبُونَ ﴿٢٧﴾

QuranUrdu.com

دکو ۶ ॥

118 یہ رب العالمین کی نازل کردہ چیز ہے۔ **119** اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار رُوح **120** اُتری ہے تاکہ ٹوآن لوگوں میں شامل ہو جو خدا کی طرف سے خلقِ خدا کو متنبہ کرنے والے ہیں، صاف صاف عربی زبان میں۔ **121** اور اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی یہ موجود ہے۔ **122** کیا ان **﴿اہل مکہ﴾** کے لیے یہ کوئی نشانی نہیں ہے کہ اسے علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں؟ **123** **﴿لیکن ان کی ہٹ دھرمی کا حال تو یہ ہے کہ﴾** اگر ہم اسے کسی عجمی پر بھی نازل کر دیتے اور یہ **﴿فتح عربی کلام﴾** وہ ان کو پڑھ کر شناختاب بھی یہ مان کرنے دیتے۔ **124** اسی طرح ہم نے اس **﴿ذکر﴾** کو مجرموں کے دلوں میں گزارا ہے۔ **125** وہ اس پر ایمان نہیں لاتے جب تک کہ عذاب الیم نہ دیکھ لیں۔ **126** پھر جب وہ بے خبری میں ان پر آپڑتا ہے اُس وقت وہ کہتے ہیں کہ ”**کیا اب ہمیں کچھ مہلت مل سکتی ہے؟**“ **127**

تو کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ تم نے کچھ غور کیا، اگر ہم انہیں برسوں تک عیش کرنے کی مہلت بھی دے دیں اور پھر وہی چیز ان پر آجائے جس سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے تو وہ سامانِ زیست جو ان کو ملا ہوا ہے ان کے کس کام آئے گا؟ **128**

﴿دیکھو﴾ ہم نے کبھی کسی بستی کو اس کے بغیر ہلاک نہیں کیا کہ اُس کے لیے خبردار کرنے والے حق نصیحت ادا کرنے کو موجود تھے۔ اور ہم ظالم نہ تھے۔ **129**

اس **﴿کتاب مبین﴾** کو شیاطین لے کر نہیں اُترے ہیں، **130** نہ یہ کام ان کو سختا ہے **131**، اور وہ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ **132** وہ تو اس کی سماعت تک سے دور رکھے گئے ہیں۔

پس اے محمد، اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبد کو نہ پکارو، ورنہ تم بھی سزا پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔

134 اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراو، **135** اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آو، لیکن اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں تو ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں۔ **136** اور اُس زبردست اور حیم پر تو گل کرو **137** جو تمہیں اُس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے جب تم اٹھتے ہو **138** ، اور سجدہ گزار لوگوں میں تمہاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔ **139** وہ سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔

لوگو، کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اُترا کرتے ہیں؟ وہ ہر جعل ساز بد کار پر اُترا کرتے ہیں۔ **140** سُنی شنائی باتیں کانوں میں پھونکتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ **141**

رہے شعراء، تو ان کے پچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ **142** کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں **143** اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں **144** ۔۔۔ جز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا، اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بد لہ لے لیا **145** ۔۔۔ اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ **146** ۱۱۶

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 118 ▲

تاریخی بیان ختم کر کے اب سلسلہ کلام اسی مضمون کی طرف پھرتا ہے جس سے سورۃ کا آغاز فرمایا گیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک دفعہ پھر پڑ کر پہلے رکوع کو دیکھ لینا چاہیے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 119 ▲

یعنی یہ "کتاب مبین" جس کی آیات یہاں سنائی جا رہی ہیں، اور یہ "ذکر" جس سے لوگ منہ موڑ رہے ہیں کسی انسان کی من گھرِ ت چیز نہیں ہے، اسے محمد ﷺ نے خود تصنیف نہیں کر لیا ہے، بلکہ یہ رب العالمین کی نازل کر دہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 120 ▲

مراد ہیں جبریل علیہ السلام، جیسا کہ دوسری جگہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: **قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجَبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ**۔ (البقرہ۔ آیت 97)۔ "کہہ دے کہ جو کوئی دشمن ہے جبریل علیہ السلام کا تو اسے معلوم ہو کہ اسی نے یہ قرآن اللہ کے حکم سے تیرے دل پر نازل کیا ہے۔" یہاں ان کا نام لینے کے بجائے ان کے لیے روح امین (امانت دار روح) کا لقب استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ رب العالمین کی طرف سے اس تنزیل کو لے کر کوئی مادی طاقت نہیں آئی ہے جس کے اندر تغیر و تبدل کا امکان ہو، بلکہ وہ ایک خالص روح ہے بلا شائਬہ مادیت، اور وہ پوری طرح امین ہے، خدا کا پیغام جیسا اس کے سپرد کیا جاتا ہے ویسا ہی بلا کم و کاست پہنچا دیتی ہے، اپنی طرف سے کچھ بڑھانا یا گھٹا دینا بطور خود کچھ تصنیف کر لینا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 121 ▲

اس فقرے کا تعلق "امانت دار روح اتری ہے" سے بھی ہو سکتا ہے اور "متنبہ کرنے والے ہیں" سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ امانت دار روح اسے صاف صاف عربی زبان میں لائی ہے، اور

دوسری صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ آنحضرت ﷺ ان انبیاء میں شامل ہوں جنہیں عربی زبان میں خلق خدا کو متنبہ کرنے کے لیے مامور فرمایا گیا تھا، یعنی ہود، صالح، اسماعیل اور شعیب علیہم السلام۔ دونوں صورتوں میں مقصود کلام ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ رب العالمین کی طرف سے یہ تعلیم کسی مردہ یا جناتی زبان میں نہیں آئی ہے، نہ اس میں کوئی معنے یا چیستاں کی سی گنجک زبان استعمال کی گئی ہے، بلکہ یہ ایسی صاف اور فصحیح عربی زبان میں ہے جس کا مفہوم و مدعہ ہر عرب اور ہر وہ شخص جو عربی زبان جانتا ہو، بے تکلف سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس سے منہ موڑ رہے ہیں ان کے لیے یہ عذر کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے کہ وہ اس تعلیم کو سمجھ نہیں سکے ہیں، بلکہ ان کے اعراض و انکار کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ اسی بیماری میں مبتلا ہیں جس میں فرعون مصر اور قوم ابراہیم اور قوم نوح اور قوم لوط اور عاد و ثمود اور اصحاب الائکہ مبتلا تھے۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 122 ▲

یعنی یہ ذکر اور یہی تنزیل اور یہی اللہ تعالیم سابق کتب آسمانی میں بھی موجود ہے۔ یہی خدائے واحد کی بندگی کا بلاوا، یہی آخرت کی زندگی کا عقیدہ، یہی انبیاء کی پیروی کا طریقہ ان سب میں بھی پیش کیا گیا ہے، سب کتابیں جو خدا کی طرف سے آئی ہیں شرک کی مذمت ہی کرتی ہیں، مادہ پرستانہ نظر یہ حیات کو چھوڑ کر اسی برحق نظر یہ حیات کی طرف دعوت دیتی ہیں جس کی بنیاد خدا کے حضور انسان کی جواب دہی کے تصور پر ہے، اور انسان سے یہی مطالبه کرتی ہیں کہ وہ اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو کر ان اللہ احکام کی پیروی اختیار کرے جو انبیاء علیہم السلام لائے ہیں۔ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں جو دنیا میں پہلی مرتبہ قرآن ہی پیش کر رہا ہو اور کوئی شخص یہ کہہ سکے تم وہ بات کر رہے ہو جو اگلوں پچھلوں میں سے کسی نے کبھی نہیں کی۔

یہ آیت من جملہ ان دلائل کے ہے جو امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی اس قدیم رائے کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھ لے تو نماز ہو جاتی ہے، خواہ وہ شخص عربی میں قرآن

پڑھنے کی قدرت رکھتا ہونہ رکھتا ہو۔ بنائے استدلال علامہ ابو بکر جصاص کے الفاظ میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں ارشاد فرمارہا ہے کہ قرآن پچھلی کتابوں میں بھی تھا، اور ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں وہ عربی الفاظ کے ساتھ نہ تھا۔ لہذا کسی دوسری زبان میں اس کے مضامین کو نقل کر دینا اسے قرآن ہونے سے خارج نہیں کر دیتا (احکام القرآن، جلد سوم، صفحہ 429)۔ لیکن اس استدلال کی کمزوری بالکل ظاہر ہے۔ قرآن مجید ہو یا کوئی دوسری آسمانی کتاب، کسی کے نزول کی کیفیت بھی یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے صرف معانی نبی کے دل پر القا کر دیے ہوں اور نبی نے پھر انہیں اپنے الفاظ میں بیان کیا ہو۔ بلکہ ہر کتاب جس زبان میں بھی آئی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معنی اور لفظ دونوں کے ساتھ آئی ہے۔ اس لیے قرآن کی تعلیم جن پچھلی کتابوں میں تھی، انسانی الفاظ میں نہیں، خدا کی الفاظ ہی میں تھی، اور ان میں سے کسی کے ترجمہ کو بھی کتاب اللہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اصل کا قائم مقام ٹھہرایا جاسکے۔ رہا قرآن تو اس کے متعلق بار بار بصراحت فرمایا گیا ہے کہ وہ لفظاً لفظاً عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے: **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا**، (یوسف۔ آیت 2) **وَكَذِلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا**، (الرعد۔ آیت 37)۔ **قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوْجٍ**، (الزمیر۔ آیت 28)۔ اور خود اسی آیت زیر بحث سے پہلے متصلًا فرمایا جا چکا ہے کہ روح الامین اسے زبان عربی میں لے کر اتراتا ہے۔ اب اس کے متعلق یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا کوئی ترجمہ جو کسی انسان نے دوسری زبان میں کیا ہو وہ بھی قرآن ہی ہو گا اور اس کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے الفاظ کے قائم مقام ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ استدلال کی اس کمزوری کو بعد میں خود امام مددوح نے ہی محسوس فرمایا تھا، چنانچہ معتبر روایات سے یہ بات نقل ہوئی ہے کہ انہوں نے اس مسئلے میں اپنی رائے سے رجوع کر کے امام ابو یوسف اور امام محمدؓ کی رائے قبول کر لی تھی، یعنی یہ کہ جو شخص عربی زبان میں قرأت پر قادر نہ ہو وہ اس وقت تک نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھ سکتا ہے جب تک اس کی زبان عربی الفاظ کے تلفظ کے قابل نہ ہو جائے، لیکن جو شخص عربی میں قرآن پڑھ سکتا ہو وہ اگر قرآن کا ترجمہ پڑھے گا تو اس

کی نمازنہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ صاحبین نے یہ رعایت دراصل ان عجمی نو مسلموں کے لیے تجویز کی تھی جو اسلام قبول کرتے ہی فوراً عربی زبان میں نماز ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکتے تھے۔ اور اس میں بنائے استدلال یہ نہ تھی کہ قرآن کا ترجمہ بھی قرآن ہے، بلکہ ان کا استدلال یہ تھا کہ جس طرح اشارے سے رکوع و سجود کرنا اس شخص کے لیے جائز ہے جو رکوع اور سجود کرنے سے عاجز ہو، اسی طرح غیر عربی میں نماز پڑھنا اس شخص کے لیے جائز ہے جو عربی تلفظ پر قادر نہ ہو۔ اور علی اہذا القیاس جس طرح عجز رفع ہو جانے کے بعد اشارے سے رکوع و سجود کرنے والے کی نمازنہ ہوگی اسی طرح قرآن کے تلفظ پر قادر ہو جانے کے بعد ترجمہ پڑھنے والے کی نماز بھی نہ ہوگی۔ (اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو مبسوط سرخُسی، جلد اول، صفحہ 37۔ فتح القدیر و شرح عنایہ علی الہدایہ جلد 1، صفحہ 190-201)۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 123 ▲

یعنی علمائے بنی اسرائیل اس بات سے واقف ہیں کہ جو تعلیم قرآن مجید میں دی گئی ہے وہ ٹھیک و ہی تعلیم ہے جو سابق کتب آسمانی میں دی گئی تھی۔ اہل مکہ خود علم کتاب سے نا آشنا ہیں، بنی اسرائیل کے اہل علم تو گرد و پیش کے علاقوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی انوکھا اور نرالا "ذکر" نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ محمد بن عبد اللہ نے لا کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہو، بلکہ ہزار ہابر س سے خدا کے نبی یہی ذکر پے درپے لاتے رہے ہیں۔ کیا یہ بات اس امر کا اطمینان کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ تنزیل بھی اسی رب العالمین کی طرف سے ہے جس نے پچھلی کتاب میں نازل کی تھیں؟

سیرت ابن ہشام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کے زمانہ نزول سے قریب ہی یہ واقعہ پیش آچکا تھا کہ جعش سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی دعوت سن کر 20 آدمیوں کا ایک وفد مکہ آیا اور اس نے مسجد حرام میں کفار قریش کے سامنے رسول اللہ ﷺ سے مل کر دریافت کیا کہ آپ کیا تعلیم لائے ہیں۔ حضور ﷺ نے جواب

میں ان کو قرآن کی کچھ آیات سنائیں۔ اس پر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ اسی وقت آپ کے رسول برحق ہونے کی تصدیق کر کے آپ پر ایمان لے آئے۔ پھر جب وہ حضور ﷺ کے پاس سے اٹھے تو ابو جہل قریش کے چند لوگوں کے ساتھ ان سے ملا اور انہیں سخت ملامت کی۔ اس نے کہا "تم سے زیادہ احمق قافلہ یہاں کبھی نہیں آیا۔ نامرا دو، تمہارے ہاں کے لوگوں نے تو تمہیں اس لیے بھیجا تھا کہ اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ، مگر تم ابھی اس سے ملے ہی تھے کہ اپنادین چھوڑ بیٹھے"۔ وہ شریف لوگ ابو جہل کی اس زجر و توقیح پر الجھنے کے بجائے سلام کر کے ہٹ گئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتے، آپ اپنے دین کے مختار ہیں اور ہم اپنے دین کے مختار ہمیں جس چیز میں اپنی خیر نظر آئی اسے ہم نے اختیار کر لیا (جلد دوم۔ صفحہ 32)۔ اسی واقعہ کا ذکر سورہ قصص میں آیا ہے کہ: **الَّذِينَ أَتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ** ﴿٢﴾ وَإِذَا يُتْلَى عَلَيْهِمْ قَالُوا أَمَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ﴿٣﴾ وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغُو أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا نَّا أَعْمَالُنَا وَنَّا كُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَمْ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَهِلِينَ ﴿٤﴾ (آیات 52-55)۔ "جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب وہ انہیں سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم اس سے پہلے بھی اسی دین اسلام پر تھے اور جب انہوں نے بیہودہ باتیں سنیں تو الجھنے سے پرہیز کیا اور بولے ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم کو سلام ہو، ہم جاہلوں کا طریقہ پسند نہیں کرتے (کہ چار باتیں تم ہمیں سناؤ تو ہم تمہیں سنائیں)۔"

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 124 ▲

یعنی اب ان ہی کی قوم کا ایک آدمی انہیں عربی مبین میں یہ کلام پڑھ کر سنارہا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے، عرب کی زبان سے عربی تقریر ادا ہونے میں آخر مجھے کی کیا بات ہے کہ ہم اسے خدا کا کلام مان لیں۔ لیکن اگر یہی فصح عربی کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی غیر عرب پر بطور مجذہ نازل کر دیا جاتا اور وہ ان کے سامنے آ کر نہایت صحیح عربی لہجہ میں اسے پڑھتا تو یہ ایمان نہ لانے کے لیے دوسرا بہانہ تراشتے، اس وقت یہ کہتے کہ اس پر کوئی جن آگیا ہے جو عجمی کی زبان سے عربی بولتا ہے۔ (تحریک کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، حُم السجدہ، حواشی 54 تا 58)۔ اصل چیز یہ ہے کہ جو شخص حق پسند ہوتا ہے وہ اس بات پر غور کرتا ہے جو اس کے سامنے پیش کی جا رہی ہو اور ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر رائے قائم کرتا ہے کہ یہ معقول بات ہے یا نہیں۔ اور جو شخص ہٹ دھرم ہوتا ہے اور نہ ماننے کا ارادہ کر لیتا ہے وہ اصل مضمون پر توجہ نہیں دیتا بلکہ اسے رد کرنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے تلاش کرتا ہے۔ اس کے سامنے بات خواہ کسی طریقے سے پیش کی جائے۔ وہ بہر حال اسے جھٹلانے کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ پیدا کر لے گا۔ کفار قریش کی اس ہٹ دھرمی کا پردہ قرآن مجید میں جگہ جگہ فاش کیا گیا ہے اور ان سے صاف صاف کہا گیا ہے کہ تم ایمان لانے کے لیے مجذہ دکھانے کی شرط آخر کس منہ سے لگاتے ہو، تم تو وہ لوگ ہو کہ تمہیں خواہ کوئی چیز دکھادی جائے تم اسے جھٹلانے کے لیے کوئی بہانہ نکال لو گے کیونکہ دراصل تمہیں حق بات مان کر نہیں دینی ہے: **وَلَوْ نَرَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَبًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسْوُهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هُذَا إِلَّا بِحُرْرٌ مُّبِينٌ ﴿٧﴾** (الانعام۔ آیت 7)۔ "اگر ہم تیرے اوپر کاغذ میں لکھی ہوئی کوئی کتاب نازل کر دیتے اور یہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تو جن لوگوں نے نہیں مانا وہ کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے"۔ **وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَاباً مِنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ لَقَالُوا إِنَّا سُكِّرْتُ أَبْصَارُنَا بَلْ**

نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ (الحجر۔ آیات 14-15)۔ "اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور یہ اس میں چڑھنے لگتے تو یہ کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے"۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 125 ▲

یعنی یہ اہل حق کے دلوں کی طرح تسلیم روح اور شفائے قلب بن کر ان کے اندر نہیں اترتا بلکہ ایک گرم لو ہے کی سلاخ بن کر اس طرح گزرتا ہے کہ وہ سیخ پا ہو جاتے ہیں اور اس کے مضامین پر غور کرنے کے بجائے اس کی تردید کے لیے حربے ڈھونڈنے میں لگ جاتے ہیں۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 126 ▲

ویسا ہی عذاب جیسا وہ تو میں دیکھ چکی ہیں جن کا ذکر اوپر اس سورے میں گزر رہے۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 127 ▲

یعنی عذاب سامنے دیکھ کر ہی مجرموں کو یقین آیا کرتا ہے کہ واقعی پیغمبر نے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح تھا۔ اس وقت وہ حسرت کے ساتھ ہاتھ مل کر کہتے ہیں کہ کاش اب ہمیں کچھ مہلت مل جائے، حالانکہ مہلت کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 128 ▲

اس فقرے اور اس سے پہلے کے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے سامع کا ذہن تھوڑا سا غور کر کے خود بھر سکتا ہے۔ عذاب کے لیے ان کے جلدی مچانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ عذاب کے آنے کا کوئی اندیشہ نہ رکھتے تھے۔ انہیں بھروساتھا کہ جیسی چیزیں کی بنسری آج تک ہم بجا تے رہے ہیں اسی طرح ہمیشہ بجا تے رہیں گے۔ اسی اعتماد پر وہ رسول اللہ ﷺ کو چیلنج دیتے تھے کہ اگر واقعی تم خدا کے رسول ہو اور ہم تمہیں جھٹلا کر عذاب الہی کے مستحق ہو رہے ہیں تو لو ہم نے تمہیں جھٹلا دیا، اب لے آؤ اپنا وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے، اچھا اگر بالفرض ان کا یہ بھروسہ صحیح ہی ہو، اگر ان پر فوراً عذاب نہ آئے، اگر انہیں

دنیا میں مزے کرنے کے لیے ایک لمبی ڈھیل بھی مل جائے جس کی توقع پر یہ پھول رہے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ جب بھی ان پر عاد و شمود یا قوم لوٹ اور اصحاب الائیکہ کی سی کوئی آفت ناگہانی ٹوٹ پڑی جس سے محفوظ رہنے کی کسی کے پاس کوئی ضمانت نہیں ہے یا اور کچھ نہیں تو موت کی آخری گھڑی آن پہنچی جس سے بہر حال کسی کو مفر نہیں، تو اس وقت عیش دنیا کے یہ چند سال آخر ان کے لیے کیا مفید ثابت ہوں گے؟

سورة الشعرااء حاشیہ نمبر: 129 ▲

یعنی جب انہوں نے خبردار کرنے والوں کی تنبیہ اور سمجھانے والوں کی نصیحت قبول نہ کی اور ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، تو ظاہر ہے کہ یہ ہماری طرف سے ان پر کوئی ظلم نہ تھا۔ ظلم تو اس وقت ہوتا جبکہ ہلاک کرنے سے پہلے انہیں سمجھا کر راہ راست پر لانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی ہوتی۔

سورة الشعرااء حاشیہ نمبر: 130 ▲

پہلے اس معاملے کا ثابت پہلو ارشاد ہوا تھا کہ یہ رب العالمین کی نازل کردہ ہے اور اسے روح الامین لے کر اترا ہے۔ اب اس کا منفی پہلو بیان کیا جا رہا ہے کہ اسے شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں جیسا کہ حق کے دشمنوں کا الزام ہے۔ کفار قریش نے نبی ﷺ کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے جھوٹ کی جو مہم چلا رکھی تھی اس میں سب سے بڑی مشکل انہیں یہ پیش آ رہی تھی کہ اس حیرت انگیز کلام کی کیا توجیہ کی جائے جو قرآن کی شکل میں لوگوں کے سامنے آ رہا تھا اور دلوں میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ یہ بات تو ان کے بس میں نہ تھی کہ لوگوں تک اس کے پہنچنے کو روک سکیں۔ اب پریشان کن مسئلہ ان کے لیے یہ تھا کہ لوگوں کو اس سے بدگمان کرنے اور اس کی تاثیر سے بچانے کے لیے کیا بات بنائیں۔ اس گھبر اہٹ میں جو الزامات انہوں نے عوام میں پھیلائے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ محمد ﷺ معاذ اللہ کا ہن ہیں اور عام کا ہنوں کی طرح ان پر بھی یہ کلام شیاطین القا کرتے ہیں۔ اس الزام کو وہ اپنا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی کے پاس اس بات کو

جانچنے کے لیے آخر کیا ذریعہ ہو سکتا ہے کہ یہ کلام کوئی فرشتہلاتا ہے یا شیطان اور شیطانی القاء کی تردید آخر کوئی کرے گا تو کسے۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 131 ▲

یعنی یہ کلام اور یہ مضامین شیاطین کے منہ پر بھتے بھی تو نہیں ہیں۔ کوئی عقل رکھتا ہو تو خود سمجھ سکتا ہے کہ کہیں یہ باتیں، جو قرآن میں بیان ہو رہی ہیں، شیاطین کی طرف سے بھی ہو سکتی ہیں؟ کیا تمہاری بستیوں میں کا ہن موجود نہیں ہیں اور شیاطین سے ربط ضبط رکھ کر جو باتیں وہ کرتے ہیں وہ تم نے کبھی نہیں سنیں؟ کیا کبھی تم نے سنا ہے کہ کسی کا ہن کے ذریعہ سے لوگوں کو خدا پرستی اور خدا ترسی کی تعلیم دی ہو؟ شرک و بت پرستی سے روکا ہو؟ آخرت کی باز پر سماں کا خوف دلایا ہو؟ ظلم اور بد کاری اور بد اخلاقیوں سے منع کیا ہو؟ نیکو کاری اور راستبازی اور خلق خدا کے ساتھ احسان کی تلقین کی ہو؟ شیاطین کا یہ مزاج کہاں ہے؟ ان کا مزاج تو یہ ہے کہ لوگوں میں فساد ڈالوائیں اور انہیں برائیوں کی طرف رغبت دلائیں۔ ان سے تعلق رکھنے والے کا ہنوں کے پاس تو لوگ یہ پوچھنے جاتے ہیں کہ عاشق کو معشوق ملے گا یا نہیں؟ جوئے میں کون ساداً مفید رہے گا؟ دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے کیا چال چلی جائے؟ اور فلاں شخص کا اونٹ کس نے چڑایا ہے؟ یہ مسائل اور معاملات چھوڑ کر کا ہنوں اور ان کے سر پرست شیاطین کو خلق خدا کی اصلاح، بھلاکیوں کی تعلیم اور برائیوں کے استیصال کی کب سے فکر لاحق ہو گئی؟

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 132 ▲

یعنی شیاطین اگر کرنا چاہیں بھی تو یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے آپ کو انسانوں کے سچے معلم اور حقیقی مزکی کے مقام پر رکھ کر خالص حق اور خالص خیر کی وہ تعلیم دے سکیں جو قرآن دے رہا ہے۔ وہ دھوکا دینے کی خاطر بھی اگر یہ روپ دھاریں تو ان کا کام ایسی آمیزشوں سے خالی نہیں ہو سکتا جو ان کی جہالت اور ان کے اندر چپھی ہوئی شیطانی فطرت کی غمازی نہ کر دیں۔ نیت کی خرابی، ارادوں کی ناپاکی،

مقاصد کی خباثت لازماً اس شخص کی زندگی میں بھی اور اس کی تعلیم میں بھی جھلک کر رہے گی جو شیاطین سے الہام حاصل کر کے پیشوں بیٹھا ہو۔ بے آمیز راستی اور خالص نیکی نہ شیاطین القاء کر سکتے ہیں اور نہ ان سے ربط ضبط رکھنے والے اس کے حامل ہو سکتے ہیں۔ پھر تعلیم کی بلندی و پاکیزگی پر مزید وہ فصاحت و بلاغت اور وہ علم حقائق ہے جو قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر قرآن میں بار بار یہ چیلنج دیا گیا ہے کہ انسان اور جن مل کر بھی چاہیں تو اس کتاب کے مانند کوئی چیز تصنیف کر کے نہیں لاسکتے: **قُلْ لَّهُمَّ اجْتَمِعُ إِلِّيْنُ وَ إِلِّيْنُ عَلَىْ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنَ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِيَغْرِيَنَّ** ﴿٣﴾ (بنی اسرائیل۔ آیت 88) **قُلْ فَأَتُوا بِسُورَةِ مِثْلِهِ وَ ادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِيْنَ** ﴿٣٨﴾ (یونس۔ آیت 38)۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 133

یعنی اس قرآن کے القاء میں دخیل ہونا تو درکنار، جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح الامین اس کو لے کر چلتا ہے اور جس وقت محمد ﷺ کے دل پر وہ اس کو نازل کرتا ہے، اس پورے سلسلے میں کسی جگہ بھی شیاطین کو کان لگا کر سننے تک کامو قع نہیں ملتا۔ وہ آس پاس کہیں پھٹکنے بھی نہیں پاتے کہ سن گن لے کر ہی کوئی بات اچک لے جائیں اور جا کر اپنے دوستوں کو بتا سکیں کہ آج محمد ﷺ یہ پیغام سنانے والے ہیں، یا ان کی تقریر میں فلاں بات کا بھی ذکر آنے والا ہے (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الحجر، حواشی 8 تا 12۔ جلد چہارم، الصافات، حواشی 5 تا 7 اور سورہ جن، آیات 8-9-27)۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 134

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ نبی ﷺ سے شرک کا کوئی خطرہ تھا اور اس بنا پر آپ کو دھمکا کر اس سے روکا گیا۔ دراصل اس سے مقصود کفار و مشرکین کو متنبہ کرنا ہے۔ کلام کا مدعا یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو تعلیم

پیش کی جا رہی ہے یہ چونکہ خالص حق ہے فرمائز دئے کائنات کی طرف سے، اور اس میں شیطانی آلاتشوں کا ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے، اس لیے یہاں حق کے معاملے میں کسی کے ساتھ رور عایت کا کوئی کام نہیں۔ خدا کو سب سے بڑھ کر اپنی مخلوق میں کوئی عزیز و محبوب ہو سکتا ہے تو وہ اس کار سول پاک ہے۔ لیکن بالفرض اگر وہ بھی بندگی کی راہ سے بال برابر ہٹ جائے اور خدا نے واحد کے سوا کسی اور کو معبد کی حیثیت سے پکار بیٹھے تو پکڑ سے نہیں بچ سکتا۔ تا بدیگر اس چہ رسد۔ اس معاملہ میں جب خود محمد ﷺ کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں تو اور کون ہے جو خدا کی خدائی میں کسی اور کو شریک ٹھہرانے کے بعد یہ امید کر سکتا ہو کہ خود بچ نکلے گا یا کسی کے بچانے سے بچ جائے گا۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 135 ▲

یعنی خدا کے اس بے لائق دین میں جس طرح نبی ﷺ کی ذات کے لیے کوئی رعایت نہیں اسی طرح نبی کے خاندان اور اس کے قریب ترین عزیزوں کے لیے بھی کسی رعایت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں جس کے ساتھ بھی کوئی معاملہ ہے اس کے اوصاف (Merits) کے لحاظ سے ہے۔ کسی کا نسب اور کسی کے ساتھ آدمی کا تعلق کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ مگر اسی وبد عملی پر خدا کے عذاب کا خوف سب کے لیے یکساں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اور سب تو ان چیزوں پر پکڑے جائیں، مگر نبی کے رشتہ دار بچ رہ جائیں۔ اس لیے حکم ہوا کہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو بھی صاف صاف متنبہ کر دو۔ اگر وہ اپنا عقیدہ اور عمل درست نہ رکھیں گے تو یہ بات ان کے کسی کام نہ آسکے گی کہ وہ نبی کے رشتہ دار ہیں۔

معتبر روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی ﷺ نے سب سے پہلے اپنے دادا کی اولاد کو خطاب فرمایا اور ایک ایک کو پکار کر صاف صاف کہہ دیا کہ یا بنت عبدالمطلب، یا عباس، یا صفیۃ عبّة رسول اللہ، یا فاطمة بنت محمد، انقذوا انفسکم من النار، فان لا املك لكم من الله شيئاً، سلونی من مال

ماشیتھم۔ "اے بنی عبد المطلب، اے عباس، اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی، اے فاطمہ محمد ﷺ کی بیٹی، تم لوگ آگ کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرو، میں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا، البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو۔" پھر آپ نے صحیح سویرے صفا کے سب سے اوپر مقام پر کھڑے ہو کر پکارا **صباحاہ** (ہائے صحیح کا خطرہ)، اے قریش کے لوگو، اے بنی کعب بن لؤیٰ، اے بنی مرہ، اے آل قُصَّیٰ، اے بنی عبد مناف، اے بنی عبد شمس، اے بنی ہاشم، اے آل عبد المطلب۔ اس طرح قریش کے ایک ایک قبلے اور خاندان کا نام لے لے کر آپ نے آواز دی۔ عرب میں قاعدہ تھا کہ جب صحیح تڑکے کسی اچانک حملے کا خطرہ ہوتا تو جس شخص کو بھی اس کا پتہ چل جاتا وہ اسی طرح پکارنا شروع کر دیتا اور لوگ اس کی آواز سنتے ہی ہر طرف سے دوڑ پڑتے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی اس آواز پر سب لوگ گھروں سے نکل آئے، اور جو خود نہ آسکا اس نے اپنی طرف سے کسی کو خبر لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "لوگو، اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کے دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو تم میری بات سمجھ مانو گے؟ سب نے کہا ہاں، ہمارے تجربے میں تم کبھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے ہو۔ آپ نے فرمایا، "اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں۔ اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیک اعمال لے کر آئیں اور تم لوگ دنیا کا وہاں سر پر اٹھائے ہوئے آؤ۔ اس وقت تم پکارو گے یا محمد ﷺ، مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمہاری طرف سے منہ پھیر لوں۔ البتہ دنیا میں میرا اور تمہارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں میں تمہارے ساتھ ہر طرح کی صلحہ رحمی کروں گا۔"

(اس مضمون کی متعدد روایات بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عائشہ،

حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت زہیر بن عمر اور حضرت قبیصہ بن مخارق سے مروی ہیں۔

یہ معاملہ صرف اس حد تک نہ تھا کہ قرآن میں **أَنْذِرْ عَشِيرَةَ الْأَقْرَبِينَ** کا حکم آیا اور حضور ﷺ نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کر کے بس اس کی تعمیل کر دی۔ دراصل اس میں جو اصول واضح کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ دین میں نبی اور اس کے خاندان کے لیے کوئی امتیازی مراعات نہیں ہیں جن سے دوسرے محروم ہوں۔ جو چیز زہر قاتل ہے وہ سب ہی کے لیے قاتل ہے، نبی کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے اس سے خود بچے اور اپنے قربی لوگوں کو اس سے ڈرانے، پھر ہر خاص و عام کو متنبہ کر دے کہ جو بھی اسے کھائے گا، ہلاک ہو جائے گا۔ اور جو چیز نافع ہے وہ سب ہی کے لیے نافع ہے، نبی کا منصب یہ ہے کہ سب سے پہلے اسے خود اختیار کرے اور اپنے عزیزوں کو اس کی تلقین کرے، تاکہ ہر شخص دیکھ لے کہ یہ وعظ و نصیحت دوسروں ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ نبی اپنی دعوت میں مخلص ہے۔ اسی طریقے پر نبی ﷺ زندگی بھر عامل رہے۔ فتح مکہ کے روز جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو آپ نے اعلان کیا کہ **کل ربانی الجاہلیۃ موضوع تحت قدمی هاتین و اول ما اضعه ربا العباس**۔ "زمانہ جاہلیت کا ہر سود جو لوگوں کے ذمے تھا میرے ان قدموں تک رومند ڈالا گیا۔ اور سب سے پہلے جس سود کو میں ساقط کرتا ہوں وہ میرے چچا عباس رضی اللہ عنہ کا ہے" (واضح رہے کہ سود کی حرمت کا حکم آنے سے پہلے حضرت عباس سود پر روپیہ چلاتے تھے اور ان کا بہت سا سود اس وقت لوگوں کے ذمے وصول طلب تھا)۔ ایک مرتبہ چوری کے جرم میں قریش کی ایک عورت فاطمہ نامی کا ہاتھ کاٹنے کا آپ نے حکم دیا۔ حضرت اسامہ بن زید نے اس کے حق میں سفارش کی۔ اس پر آپ نے فرمایا خدا کی قسم، اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 136 ▲

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارے رشته داروں میں سے جو لوگ ایمان لا کر تمہاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ نرمی اور ملاطفت اور تواضع کا رویہ اختیار کرو، اور جو تمہاری بات نہ مانیں ان سے اعلان برآت کر دو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ارشاد صرف ان رشته داروں سے متعلق نہ ہو جنہیں متنبہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ سب کے لیے عام ہو۔ یعنی جو بھی ایمان لا کر تمہارا اتباع کرے اس کے ساتھ تواضع برتو اور جو بھی تمہاری نافرمانی کرے اس کو خبردار کر دو کہ تیرے اعمال سے میں بری الذمہ ہوں

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت قریش اور آس پاس کے اہل عرب میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے، مگر انہوں نے عملًا آپ کی پیروی اختیار نہ کی تھی، بلکہ وہ بدستور اپنی گمراہ سوسائٹی میں مل جل کر اسی طرح کی زندگی بس کر رہے تھے جیسی دوسرے کفار کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے ماننے والوں کو ان اہل ایمان سے الگ قرار دیا جنہوں نے حضور ﷺ کی صداقت تسلیم کرنے کے بعد آپ کا اتباع بھی اختیار کر لیا تھا۔ تواضع برتنے کا حکم صرف اسی موارد ذکر گروہ کے لیے تھا۔ باقی رہے وہ لوگ جو حضور ﷺ کی فرماں برداری سے منہ موڑے ہوئے تھے، جن میں آپ کی صداقت کو ماننے والے بھی شامل تھے اور آپ کا انکار کر دینے والے بھی، ان کے متعلق حضور ﷺ کو ہدایت کی گئی کہ ان سے بے تعلقی کا اظہار کر دو اور صاف صاف کہہ دو کہ اپنے اعمال کا نتیجہ تم خود بھلتو گے، تمہیں خبردار کر دینے کے بعد اب مجھ پر تمہارے کسی فعل کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 137 ▲

یعنی دنیا کی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی بھی پرواہ کرو اور اس ذات کے بھروسے پر اپنا کام کیے چلے جاؤ جو زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ اس کا زبردست ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ جس کی پشت پر اس کی تائید ہو

اسے دنیا میں کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا۔ اور اس کا رحیم ہونا اس اطمینان کے لیے کافی ہے کہ جو شخص اس کی خاطر اعلائے کلمۃ الحق کے کام میں جان لڑائے گا اس کی کوششوں کو وہ کبھی رایگاں نہ جانے دے گا۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 138 ▲

اٹھنے سے مراد راتوں کو نماز کے لیے اٹھنا بھی ہو سکتا ہے اور فریضہ رسالت ادا کرنے کے لیے اٹھنا بھی۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 139 ▲

اس سے کئی معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ جب نماز باجماعت میں اپنے مقتدیوں کے ساتھ اٹھتے اور بیٹھتے اور رکوع و سجود کرتے ہیں اس وقت اللہ تعالیٰ آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ دوسرے جب راتوں کو اٹھ کر آپ اپنے ساتھیوں کو (جن کے لیے "سجدہ گزار" کا لفظ امتیازی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے) دیکھتے پھر تے ہیں کہ وہ اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں، اس وقت آپ اللہ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہوتے۔ تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس تمام دوڑ دھوپ اور تنگ و دو سے واقف ہے جو آپ اپنے سجدہ گزار ساتھیوں کی معیت میں اس کے بندوں کی اصلاح کے لیے کر رہے ہیں چوتھے یہ کہ سجدہ گزار لوگوں کے گروہ میں آپ کے تمام تصرفات اللہ کی نگاہ میں ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ آپ کس طرح ان کی تربیت کر رہے ہیں، کیسا کچھ ان کا تزکیہ آپ نے کیا ہے اور کس طرح مس خام کو کندن بناؤ کر رکھ دیا ہے۔

نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی ان صفات کا ذکر یہاں جس غرض کے لیے کیا گیا ہے اس کا تعلق اوپر کے مضمون سے بھی ہے اور آگے کے مضمون سے بھی، اوپر کے مضمون سے اس کا تعلق یہ ہے کہ آپ حقیقت میں اللہ کی رحمت اور اس کی زبردست تائید کے مستحق ہیں، اس لیے کہ اللہ کوئی اندھا بہرا معبود نہیں ہے، دیکھنے اور سننے والا فرمazonا ہے، اس کی راہ میں آپ کی دوڑ دھوپ اور اپنے سجدہ گزار ساتھیوں میں آپ کی سرگرمیاں، سب کچھ اس کی نگاہ میں ہیں۔ بعد کے مضمون سے اس کا تعلق یہ ہے کہ جس شخص کی زندگی یہ کچھ ہو جیسی کہ محمد ﷺ کی ہے، اور جس کے ساتھیوں کی صفات وہ کچھ ہوں جیسی کہ اصحاب محمد ﷺ کی ہیں اس

کے متعلق کوئی عقل کا اندازہ ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس پر شیاطین اترتے ہیں یا وہ شاعر ہے۔ شیطان جن کا ہنوں پر اترتے ہیں اور شعراء اور ان کے ساتھ لگے رہنے والوں کے جیسے کچھ رنگ ڈھنگ ہیں، وہ آخر کس سے پوشیدہ ہیں۔ تمہارے اپنے معاشرے میں ایسے لوگ کثرت سے پائے ہی جاتے ہیں۔ کیا کوئی آنکھوں والا ایمانداری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ اسے محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب کی زندگی میں اور شاعروں اور کاہنوں کی زندگی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ اب یہ کیسی ڈھنٹائی ہے کہ ان خدا کے بندوں پر کھلمن کھلا کہانت اور شاعری کی پھیلتی کسی جاتی ہے اور کسی کو اس پر شرم بھی نہیں آتی۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 140 ▲

مراد ہیں کاہن، جو تشی، فال گیر، رہاں، اور "عامل" قسم کے لوگ جو غیب دانی کا ڈھونگ رچاتے پھرتے ہیں۔ گول مول لچھے دار باتیں بنایا کر لوگوں کی قسمتیں بتاتے ہیں، یا سیانے بن کر جنوں اور روحوں اور موکلوں کے ذریعہ سے لوگوں کی بگڑی بنانے کا کاروبار کرتے ہیں۔

سورة الشعراً حاشیہ نمبر: 141 ▲

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ شیاطین کچھ سن گن لے کر اپنے اولیاء پر القاء کرتے ہیں اور اس میں تھوڑی سی حقیقت کے ساتھ بہت سا جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ جھوٹ لپاٹیے کاہن شیاطین سے کچھ باتیں سن لیتے ہیں اور پھر اپنی طرف سے بہت سا جھوٹ ملا کر لوگوں کے کانوں میں پھونکتے پھرتے ہیں۔ اس کی تشریح ایک حدیث میں بھی آئی ہے جو بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ بعض لوگوں نے نبی ﷺ سے کاہنوں کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا وہ کچھ نہیں ہیں۔ انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ بعض اوقات تو وہ ٹھیک بات بتا دیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہ ٹھیک بات جو ہوتی ہے اسے کبھی کبھار جن لے اڑتے ہیں اور جا کر اپنے دوست کے کان میں پھونک دیتے ہیں، پھر وہ اس کے ساتھ جھوٹ کی بہت سی آمیزش کر کے ایک داستان بنالیتا ہے۔

سورة الشعراًء حاشیہ نمبر: 142 ▲

یعنی شاعروں کے ساتھ لگے رہنے والے لوگ اپنے اخلاق، عادات و خصائص اور افتادہ مزاج میں ان لوگوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو محمد ﷺ کے ساتھ تمہیں نظر آتے ہیں۔ دونوں گروہوں کا فرق ایسا کھلا ہوا فرق ہے کہ ایک نظر دیکھ کر ہی آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور وہ کیسے۔ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راستبازی اور خدا ترسی ہے۔ بات بات میں ذمہ داری کا احساس ہے۔ بر تاؤ میں لوگوں کے حقوق کا پاس و لحاظ ہے۔ معاملات میں کمال درجہ کی دیانت و امانت ہے اور زبان جب کھلتی ہے خیر ہی کے لیے کھلتی ہے، شر کا کلمہ کبھی اس سے ادا نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ ان لوگوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے، ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے جس کی دھن میں یہ رات دن لگے ہوئے ہیں اور ان کی ساری زندگی ایک مقصد عظیم کے لیے وقف ہے۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور حاضرین اچھل کر ان پر داد دے رہے ہیں۔ کہیں کسی زن بازاری یا کسی گھر کی بہوبیٰ کا حسن موضوع سخن ہے اور سننے والے اس پر مزے لے رہے ہیں۔ کہیں جنسی مواصحت کی حکایت بیان ہو رہی ہے اور پورے مجمع پر شہوانیت کا بھوت مسلط ہے۔ کہیں ہرzel بکا جارہا ہے یا مسخرہ پن کی باتیں ہو رہی ہیں اور مجمع میں ہر طرف ٹھٹھے لگ رہے ہیں۔ کہیں کسی کی ہجوڑائی جارہی ہے اور لوگ اس سے لطف لے رہے ہیں۔ کہیں کسی کی بے جا تعریف ہو رہی ہے اور اس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے بر سائے جا رہے ہیں۔ اور کہیں کسی کے خلاف نفرت، عداوت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں اور سننے والوں کے دلوں میں ان سے آگ سی لگی جاتی ہے۔ ان مجلسوں میں شاعروں کے کلام سننے کے لیے جو ٹھٹھے کے ٹھٹھے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے شاعروں کے پیچھے جو لوگ لگے پھرتے ہیں ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جذبات و خواہشات کی رو میں بہنے والے، اور لطف ولذت کے

پرستار، نیم حیوان قسم کے لوگ ہیں جن کے ذہن کو کبھی یہ خیال چھو بھی نہیں گیا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کا کوئی بلند تر مقصد و نصب العین بھی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کا کھلا کھلا فرق و امتیاز اگر کسی کو نظر نہیں آتا تو وہ اندھا ہے، اور اگر سب کچھ دیکھ کر بھی کوئی محض حق کو نیچا دکھانے کے لیے ایمان نگل کریں کہتا ہے کہ محمد ﷺ اور ان کے گرد جمع ہونے والے اسی قبیل کے لوگ ہیں جیسے شعراء اور ان کے پیچھے لگے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں، تو وہ جھوٹ بولنے میں بے حیائی کی ساری حدیں پار کر گیا ہے۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 143 ▲

یعنی کوئی ایک متعین را نہیں ہے جس پر وہ سوچتے اور اپنی قوت گویائی صرف کرتے ہوں، بلکہ ان کا تو سِن فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھکلتا پھرتا ہے اور جذبات یا خواہشات و اغراض کی ہر نوعی روان کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کرتی ہے جسے سوچنے اور بیان کرنے میں اس بات کا کوئی لحاظ سرے سے ہوتا ہی نہیں کہ یہ بات حق اور صدق بھی ہے۔ کبھی ایک لہر اٹھی تو حکمت و موعظت کی باتیں ہونے لگیں اور کبھی دوسری لہر آئی تو اسی زبان سے انتہائی گندے سفلی جذبات کا ترشح شروع ہو گیا۔ کبھی کسی سے خوش ہوئے تو اسے آسمان پر چڑھا دیا اور کبھی بگڑ بیٹھے تو اسی کو تحت الشری میں جا گرا یا۔ ایک بخیل کو حاتم اور ایک بزدل کو رستم و اسفندیار پر فضیلت دینے میں انہیں ذرا تامل نہیں ہوتا اگر اس سے کوئی غرض وابستہ ہو۔ اس کے بر عکس کسی سے رنج پہنچ جائے تو اس کی پاک زندگی پر دھبہ لگانے اور اس کی عزت پر خاک پھینکنے میں، بلکہ اس کے نسب پر طعن کرنے میں بھی ان کو شرم محسوس نہیں ہوتی۔ خدا پرستی اور دہریت، مادہ پرستی اور روحانیت، حسن اخلاق اور بد اخلاقی، پاکیزگی اور گندگی، سنجیدگی اور ہرزل، قصیدہ اور ہجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو بہ پہلو مل جائے گا۔ شعراء کی ان معروف خصوصیات سے جو شخص واقف ہو اس کے دماغ میں آخر یہ بے تکلی بات کیسے اتر سکتی ہے کہ اس قرآن کے لانے والے پر شاعری کی تہمت رکھی جائے جس کی

تقریر بچی تلی، جس کی بات دو ٹوک، جس کی راہ بالکل واضح اور متعین ہے اور جس نے حق اور راستی اور بھلانی کی دعوت سے ہٹ کر کبھی ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکالا ہے۔

قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر نبی ﷺ کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ آپ کے مزاج کو تو شاعری کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے: **وَمَا عَلِمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ**، (لیس۔ آیت 69) "هم نے اس کو شعر نہیں سکھایا ہے نہ یہ اس کے کرنے کا کام ہے"۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جو لوگ بھی نبی ﷺ سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے وہ سب اسے جانتے تھے۔ معتبر روایات میں آیا ہے کہ کوئی شعر حضور ﷺ کو پورا یاد نہ تھا۔ دوران گفتگو میں کبھی کسی شاعر کا کوئی اچھا شعر زبان مبارک پر آتا بھی تو غیر موزوں پڑھ جاتے تھے، یا اس میں الفاظ کا الٹ پھیر ہو جاتا تھا۔ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دوران تقریر میں آپ ﷺ نے شاعر کا مصروع یوں نقل کیا:

کفی بالسلام والشیب للبرع ناہیا

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ اصل مصروع یوں ہے:

کفی الشیب والسلام للبرع ناہیا

ایک مرتبہ عباس بن مرداس سلیمانی سے آپ ﷺ نے پوچھا، کیا تم ہی نے یہ شعر کہا ہے:

اتجعل نهی ونهب العبید و بین الاقرع و عینہ

انہوں نے عرض کیا آخری فقرہ یوں نہیں ہے بلکہ یوں ہے **بین عینہ و الاقرع**۔

آپ ﷺ نے فرمایا معنی میں تو دونوں یکساں ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ کبھی اشعار بھی اپنی تقریروں میں استعمال فرماتے تھے؟ انہوں نے فرمایا شعر سے بڑھ کر آپ کو کسی چیز سے نفرت نہ تھی۔ البتہ کبھی کبھار بھی قیس کے شاعر کا ایک شعر

پڑھتے تھے مگر اول کو آخر اور آخر کو اول پڑھ جاتے تھے۔ حضرت ابو بکر عرض کرتے یا رسول اللہ یوں نہیں بلکہ یوں ہے، تو آپ فرماتے کہ "بھائی میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر گوئی میرے کرنے کا کام ہے"

جس قسم کے مضامین سے عرب کی شاعری لبریز تھی وہ یا تو شہوانیت اور عشق بازی کے مضامین تھے، یا شراب نوشی کے، یا قبائلی منافرت اور جنگ و جدل کے، یا نسلی فخر و غرور کے۔ نیکی اور بھلائی کی باتیں ان میں بہت سی کم پائی جاتی تھیں۔ پھر جھوٹ، مبالغہ، بہتان، ہجو، بے جا تعریف، ڈینگیں، طعن، پھبٹیاں، اور مشرکانہ خرافات تو اس شاعری کی رگ رگ میں پیوست تھیں۔ اسی لیے نبی ﷺ کی رائے اس شاعری کے متعلق یہ تھی کہ: لان یبتلیع جوف احد کم قیحا خیر لہ من ان یبتلیع شعراً، "تم میں سے کسی شخص کا خول پیپ سے بھر جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے"۔ تاہم جس شعر میں کوئی اچھی بات ہوتی تھی آپ اس کی داد بھی دیتے تھے اور آپ کا ارشاد تھا کہ: ان من الشعل حکمة۔ "بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں"۔ امیہ یہ ابی الصَّدُّلْ کا کلام سن کر آپ نے فرمایا: امن شعرہ و کفر قلبہ۔ اس کا شعر مومن ہے مگر اس کا دل کافر ہے"۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے سو(100) کے قریب عمدہ اشعار آپ کو سنائے اور آپ فرماتے گئے "اور سناؤ"

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 144 ▲

یہ شاعروں کی ایک اور خصوصیت ہے جو نبی ﷺ کے طرز عمل کی عین ضد تھی۔ حضور ﷺ کے متعلق آپ کا ہر جانے والا جانتا تھا کہ آپ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ آپ کے قول اور فعل کی مطابقت ایسی صریح حقیقت تھی جس سے آپ کے گرد و پیش کے معاشرے میں کوئی انکارناہ کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس شعراء کے متعلق کس کو معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں کہنے کی باتیں اور کرنے کی اور سخاوت کا مضمون اس زور شور سے بیان کریں گے کہ آدمی سمجھے شاید ان سے بڑھ کر دریا دل کوئی نہ ہو گا۔ مگر

عمل میں کوئی دیکھے تو معلوم ہو گا کہ سخت بخیل ہیں۔ بہادری کی باتیں کریں گے مگر خود بزدل ہوں گے۔ بے نیازی اور قناعت و خود داری کے مضامین باندھیں گے مگر خود حرص و طمع میں ذلت کی آخری حد کو پار کر جائیں گے۔ دوسروں کی ادنیٰ کمزوریوں پر گرفت کریں گے مگر خود بدترین کمزوریوں میں مبتلا ہوں گے۔

سورة الشعرا، حاشیہ نمبر: 145 ▲

یہاں شعراء کی اس عام مدت سے جو اوپر بیان ہوئی، ان شعراء کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار خصوصیات کے حامل ہوں :

اول یہ کہ وہ مومن ہوں، یعنی اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتابوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔

دوسرے یہ کہ اپنی عملی زندگی میں صالح ہوں، بدکار اور فاسق و فاجرنہ ہوں، اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو کر جھک نہ مارتے پھریں۔

تیسرا یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہوں، اپنے عام حالات اور اوقات میں بھی، اور اپنے کلام میں بھی۔ یہ نہ ہو کہ شخصی زندگی توزہ و تقویٰ سے آرستہ ہے مگر کلام سر اسرارندی و ہوسناکی سے لبریز۔ اور یہ بھی نہ ہو کہ شعر میں تو بڑی حکمت و معرفت کی باتیں بگھاری جا رہی ہیں مگر ذاتی زندگی کو دیکھیے تو یادِ خدا کے سارے آثار سے خالی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں یکساں مذموم ہیں۔ ایک پسندیدہ شاعر وہ ہی ہے جس کی نجی زندگی بھی خدا کی یاد سے معمور ہو اور شاعرانہ قابلیتیں بھی اس راہ میں وقف رہیں جو خدا سے غافل لوگوں کی نہیں بلکہ خداشناس، خدادوست اور خدا پرست لوگوں کی راہ ہے۔

چوتھی صفت ان مستثنیٰ قسم کے شاعروں کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ شخصی اغراض کے لیے تو کسی کی ہجونہ کریں، نہ ذاتی یا نسلی و قومی عصبیتوں کی خاطر انتقام کی آگ بھڑکائیں، مگر جب ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت

کے لیے ضرورت پیش آئے تو پھر زبان سے وہی کام لیں جو ایک مجاہد تیر و شمشیر سے لیتا ہے۔ ہر وقت گھلیاتے ہی رہنا اور ظلم کے مقابلے میں نیاز منداہ معروضات ہی پیش کرتے رہنا مومنوں کا شیوه نہیں ہے۔ اسی کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ کفار و مشرکین کے شاعر اسلام اور نبی ﷺ کے خلاف الزامات کا جو طوفان اٹھاتے اور نفرت و عداوت کا جوز ہر پھیلاتے تھے اس کا جوب دینے کے لیے حضور ﷺ خود شعر ائمہ اسلام کی ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ نے فرمایا: **اَهْجِمْ فَوَالذِّي** نفسی بیدہ لہوا شد علیہم من النبیل، "ان کی ہجو کہو، کیونکہ اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تمہارا شعر ان کے حق میں تیر سے زیادہ تیز ہے"۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا **اَهْجِمْ وَجَبَرِيلُ مَعَكُ، وَرُوحُ الْقَدْسُ مَعَكُ،** "ان کی خبر لو اور جبریل تمہارے ساتھ ہے"۔ "کہو اور روح القدس تمہارے ساتھ ہے" آپ کا ارشاد تھا کہ: **إِنَّ الْمُؤْمِنَ يَجَاهُ بِسَيْفِهِ وَلِسَانِهِ**۔ "مومن توار سے بھی لڑتا ہے اور زبان سے بھی"۔

سورة الشعراء حاشیہ نمبر: 146 ▲

ظلم کرنے والوں سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو حق کو نیچا دکھانے کے لیے سراسر ہٹ دھرمی کی راہ سے نبی ﷺ پر شاعری اور کہانت اور ساحری اور جنون کی ٹھیٹیں لگاتے پھرتے تھے تاکہ ناواقف لوگ آپ کی دعوت سے بد گمان ہوں اور آپ کی تعلیم کی طرف توجہ نہ دیں۔